ادب اور تہذیب

فرحت اللہ انصاری

اردو چینل
www.urduchannel.in

پبلشر ـــ آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی

پرنٹر ـــ حفیظ الرحمٰن نعمانی

مطبوعہ

تنویر پریس امین آباد لکھنؤ

فہرست مضامین

قیمت تین روپیے

ملنے کا پتہ:-

آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی

تعارف

ہندوستان میں دورِ جدید کا آغاز اس احساس کے آغاز کا بھی نام ہے کہ ادب انسانی شعور کی توسیع کرتا اور نظام جذبات میں ایک طرح کی فنکارانہ ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح کا احساس رکھنے والے ادیب نہ تو ادب کو محض تفریحی مشغلہ قرار دیتے ہیں اور نہ تبلیغ بلکہ اُس کے ذریعہ سے اُن بنیادی تصورات کو دوسروں تک پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں جنھیں اُن کے نظام افکار میں عقیدے کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے دورِ جدید کے سارے بڑے ادیب اور شاعر ادب اور مقصد میں توازن قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سرسید، آزاد، حالی، نذیر احمد، اقبال، چکبست، سب قومی تعمیر اور ارتقا کے مخصوص تصورات سے سرشار تھے

اور اپنے اس خیال پر شرمندہ نہیں تھے کہ وہ ادیب رہتے ہوئے وطن اور زندگی کی خدمت بھی کر رہے ہیں۔ اس کا اصل سبب کیا تھا؟ غالباً یہی کہ وہ اس وقت جب ملک قومی احساس کے ایک نئے دائرہ میں قدم رکھ رہا تھا، یہ کہنے کی جرأت رکھتے تھے کہ ہمیں تبدیلی کی حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے اور نہ جاننے والوں کو بتانا چاہیے کہ ادب بھی زندگی کے کام آسکتا ہے۔ یہ انھیں کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے کا فیض تھا کہ ادب کی محفل میں بہت سے نئے چراغ روشن ہو گئے، کچھ نئے اصنافِ ادب وجود میں آگئے اور کاروباری، مذہبی اور داستانی نثر کے علاوہ ایک ایسی ادبی نثر کا بھی ارتقا ہوا جو مسائلِ حیات کو عام فہم اسلوب میں شگفتگی کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن اس نثر سے جتنا کام لینا چاہیے تھا وہ نہیں لیا گیا۔ موجودہ دور میں بھی، جب پریس کی آسانیاں ہیں، اخبارات اور رسائل کی فراوانی ہے اور تعلیم کی اوسط میں اضافہ ہو رہا ہے، ادب پوری لگن سے ذہنوں کی تربیت میں حصہ لینے کا کام انجام نہیں دے رہا ہے۔

اس وقت عام ذہنوں پر جو ادب مسلط ہے اس سے یہ امید بہت کم کی جا سکتی ہے کہ وہ لوگوں میں صحت مند تہذیبی شعور کی تخلیق کرے گا۔ سستے رومانی قصے، جاسوسی ناول، معمولی مذہبی رسائل سے بازار بھرے

پڑے ہیں، وہی پڑھے جا رہے ہیں اور وہی چھپتے ہیں۔ اس بات کی طرف بہت کم لوگوں کی توجہ ہے کہ پڑھنے والوں کو ان نسخوں کا عادی نہیں بنانا چاہیے کیونکہ محض انھیں پر اکتفا کرنے سے وہ ذہنی زوال اور علمی انحطاط پیدا ہوتا ہے جو قومی تعمیر اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رومانی یا جاسوسی قصے نہ شائع کیے جائیں یا لوگ مذہبی ادب کا مطالعہ نہ کریں اور نہ یہ مقصد ہے کہ صرف فلسفہ معاشیات اور عمرانیات ہی سے متعلق مضامین لکھے جائیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ زندگی کے سنجیدہ مسائل ایسے انداز میں پیش کئے جائیں جن سے تفریح اور تعلیم دونوں مقصد پورے ہوں۔

زندگی بڑی پیچیدگی کی حامل ہوتی ہے، وہ خانوں میں بٹی ہوتی بھی ہے اور کلی بھی، وہ ماحول اور وقت کے تقاضوں سے متاثر بھی ہوتی ہے اور ماحول کو بناتی اور نئے تقاضے پیدا بھی کرتی ہے لیکن ان تمام پہلوؤں کے سمجھنے کے لئے سنجیدہ فکر کی ضرورت ہے، زندگی کی عکاسی اسی وجہ سے ایک مشکل عمل بن جاتی ہے۔ وہ نہ تعیش ہے نہ تقدس، نہ قہقہہ ہے نہ آنسو، بلکہ ان سب کا ایک خوبصورت امتزاج ہے، اگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے تو ادب میں مکمل زندگی کا عکس نظر نہیں آتا، ایک انگاپن بڑھ جاتا ہے اور بہت سے پہلو نظر دل

سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اس بات کو سمجھنا صرف رہنماؤں
اور سیاست دانوں کا کام نہیں ہے بلکہ ادیبوں کے لئے بھی ضروری
ہے کہ وہ نئے سانچے میں ڈھلتی ہوئی زندگی کو اچھی طرح سمجھیں۔
اگر ادیب اس سے کنارہ کشی کریں گے تو قاری بھی اسی راہ پر
چل کھڑے ہوں گے۔

ہمارا عہد درحقیقت شکستِ نظریات کا عہد ہے اس لئے پڑھنے
اور لکھنے والے دونوں فرار کی راہ ڈھونڈھتے ہیں۔ ایک متوسط
درجہ کا شعور رکھنے والا انسان رومان یا روحانیت میں کھو کر
تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے۔ نظریات پیش کرنے والوں کے
بلند بانگ دعووں اور اپنی بات منوانے کی جد وجہد کرنے
والوں کی ہنگامہ خیزیاں اکثر الجھن کا سبب بن جاتی ہیں اور
جہاں وہ نظریات کے مبلغوں میں تنگ نظری، ہٹ دھرمی اور
تنگ ظرفی پیدا کرتی ہیں وہاں پڑھنے والوں کو بندھے ٹکے اصولوں
پر چلنے کی تلقین کرکے انھیں دوسرے راستوں کی حقیقت معلوم
کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ یہی وہ المیہ ہے جس سے بچنے اور دوسروں
کو بچانے کی ضرورت ہے ورنہ ہمارا ایک دلدل میں پھنس کر رہ
جانا یقینی ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم ایک عہد سے نکل چکے ہیں اور دوسرے عہد
میں گامزن ہیں۔ ویسے بظاہر ہمارے سامنے ایک منزل ہے، سلطانی
جمہور کی منزل۔ کبھی کبھی راستہ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے،
ایمانداری، امن دوستی، امداد باہمی اور جد وجہد کا راستہ۔ کچھ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی قدر آگے بڑھے بھی ہیں لیکن ہندوستان
کے عظیم الشان قافلے میں مذہب، عقیدہ، تعلیم، تہذیب، طبقہ اور
زبان کے لحاظ سے اتنے متنوع عناصر شامل ہیں کہ سب کا ایک ساتھ
قدم ملا کر چلنا بعض اوقات ناممکن نظر آتا ہے۔ چالیس کروڑ انسانوں
کی دنیا کو ہم خیال بنانا تو ایک خواب ہی معلوم ہوتا ہے لیکن اس
بات کا یقین ضرور ہے کہ اگر نصب العین کے متعلق اہم باتوں کا شعور
لوگوں کے اندر پیدا ہو جائے تو قدم منزل کی طرف تیزی سے اٹھ
سکتے ہیں۔ اس کارواں میں کچھ ایسے ہیں جو منزل ہی سے گریزاں
ہیں، کچھ شک میں مبتلا ہیں، کچھ ہوا کا رخ دیکھ رہے ہیں، کچھ نے
ابھی ادھر نگاہ ہی نہیں اٹھائی ہے، کچھ تقدیر کے قائل ہیں،
کچھ تدبیر کے، کچھ مذہب سے فال دیکھتے ہیں، کچھ سیاسی نظریات
سے۔ کچھ بے عمل ہیں، کچھ باعمل ـــــ اس طرح نتائج کے لحاظ سے
ابھی بڑی افراتفری اور بڑی بے یقینی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا

ادیب کا قلم اس سلسلہ میں کسی قسم کی رہنمائی نہیں کر سکتا؟ کیا وہ منزل کا کوئی سراغ نہیں بتا سکتا؟ کیا اُسے "مارا چہ ازیں قصہ" کہہ کر اپنے کو اس معرکۂ مرگ و زیست سے بالکل الگ رکھنا چاہئے؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر دانستہ نہیں تو نادانستہ ادیب ان خیالات کی اشاعت کرنے لگتا ہے جو اُسے عزیز ہیں۔ ہاں ایک مضبوط آمرانہ تنظیم کی بات اور ہے، وہاں ادیب کا قلم مجبور ہوتا ہے، ضمیر پابند ہوتا ہے اور خیالات پر پہرے لگے ہوتے ہیں۔ ہندستان اس لحاظ سے جمہوریت کے تجربہ میں بہت آگے ہے۔ ہمارا معاشرہ اشتراکی اور اجتماعی زندگی کی طرف بڑھنے کے ساتھ ساتھ جماعتی اور انفرادی آزادی کا بھی تجربہ کر رہا ہے اور اگرچہ اس کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پڑ رہی ہیں لیکن ادیب کا دم نہیں گھٹ رہا ہے، یہ صحیح ہے کہ بعض وجوہ سے ابھی ہمارے ادیب اپنی پوری قوت سے اس تجربہ کا ذکر نہیں کر رہے ہیں لیکن ایسا کرنے میں انھیں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔

ان چند تمہیدی صفحات سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اگر ادیب چاہے تو اپنے عہد کی ترجمانی اس طرح کر سکتا ہے کہ اس کی اعلیٰ تعمیری قدریں نگاہوں کے سامنے آ جائیں۔ یہ صرف ادبی مشق کی

بات نہیں عقیدے اور لگن کی بات بھی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ کا مصنف ایک باشعور ادیب ہے۔ اُسے اپنے وطن سے محبت، اپنی تہذیب سے عشق اور اپنے ادب سے الفت ہے لیکن یہ محبت اندھی نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس وقت ہندوستان میں جمہوریت اور اشتراکیت کا جو تجربہ ہو رہا ہے اس کے اندر تعمیر و ترقی کے بہت سے امکانات پوشیدہ ہیں اور انھیں بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اشتراکیت نے ایک نئے قالب میں جنم لیا ہے، حامیانِ انقلاب شمشیر کو نیام میں رکھ کر تعمیر و تدبیر پر اُتر آئے ہیں، اور اس مشترکہ تہذیب کے لئے باقاعدہ جد و جہد شروع ہو گئی ہے جس کا خواب ہم نے اکثر دیکھا ہے۔ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی تنگ نظری، تعصب اور فرقہ پرستی سے پڑ رہی ہے اور یہ تمام باتیں روحِ مذہب کی نفی کرتی ہیں۔ ان دونوں باتوں میں فرق کرنا ہی ہمارے شعور کی صحتمندی کی دلیل ہے۔ یہی بنیادی تصورات اُس کے پیشِ نظر ہیں اور وہ انسانیت کے مستقبل کی طرف سے پُر اُمید ہے اس لئے اُس نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں جھنجھلاہٹ، غصّہ اور بے جا طنز و تعریض نہیں، ادبی استدلالی انداز اور اُمید کی شگفتگی ہے جس سے یہ مضامین تازہ گفتاری کا خوبصورت مرقع بن گئے ہیں۔

میں فرحت اللہ انصاری کو بیس بائیس سال سے جانتا ہوں، اُن
کی ذہنی دیانتداری، اظہار خیال کی بے باکی، شگفتہ مزاجی اور ادبی
ذوق سے اچھی طرح واقف ہوں اور جس وقت ان کے مجموعہ مضامین
پر تعارف کے طور پر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں، اُن کے مضامین کو
انھیں خصوصیات سے مملو پاتا ہوں۔ ان میں بندھے ٹکے خیالات، دوسروں
کے اقوال، تبلیغی نعرے اور مرعوب کن فلسفیانہ اصطلاحات کا دُور
دور تک پتہ نہیں، یہ اُن کی انفرادی افتاد طبع اور شخصیت کے مُرقعے
ہیں جن کو ادب کے چوکھٹے میں سجایا گیا ہے۔ ان پندرہ مضامین میں چند
مضامین شخصیتوں کے متعلق ہیں، چند ہماری مشترکہ تہذیب کے متعلق،
کچھ ادبی ہیں اور کچھ انشائی انداز میں تحریر کئے ہوئے ہلکے پھلکے مضامین
لیکن جب پڑھنے والا ان تمام مضامین کو ختم کرے گا تو اُسے یہ محسوس ہوگا
کہ فرحت اللہ انصاری نے اُس کے ذہن پر کوئی بوجھ ڈالے بغیر اُسے
اپنی قومی تہذیب کی اعلیٰ ترین قدروں اور صحت مند جمہوریت کے
بنیادی اصولوں کی جھلک دکھائی ہے، اُن سے محبت کرنے اور اُن کو
تعمیر و توسیع میں شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔ اس میں انھیں
کامیابی دو وجہوں سے ہوئی ہے، اوّل تو یہ کہ انھوں نے اپنے
خیالات کو دوسروں پر مسلط کرنے کے بجائے انھیں اپنے سوچنے کے

انداز میں شریک کرنا چاہا ہے اور اس طرح انھیں اس الجھن میں مبتلا
نہیں ہونے دیا ہے کہ مصنف انھیں اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہے۔
جب پڑھنے والے کو یہ اطمینان ہو جائے تو وہ اپنے ذہن کے دروازے
کھول دیتا ہے اور لکھنے والے کو اُس کے اندر داخل ہونے کا موقع
دیتا ہے۔ دوسری خصوصیت ان مضامین کے لکھنے کا وہ ہلکا پھلکا انداز
ہے جو کسی وقت بھی دلچسپی میں کمی نہیں ہونے دیتا۔

مثال کے طور پر اس مجموعے کا پہلا ہی مضمون پیش کیا جا سکتا
ہے۔ مہاتما گاندھی کی شخصیت، سوانح حیات اور کارہائے نمایاں
پر دنیا کی مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اس لحاظ سے یہ کوئی
نیا یا انوکھا موضوع نہیں ہے لیکن فرحت اللہ انصاری نے چند صفحات
میں اُن کی سیرت اور حیات کے چند نقوش (جو بہ ظاہر بے ترتیب ہیں)
اس خوبی سے پیش کر دیئے ہیں کہ ایک نظر میں ان کی عظمت کے کئی
پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ نہ تو کوئی سوانح عمری ہے، نہ مدلل مضمون،
لیکن اس سے لکھنے والے کا مطمح نظر بالکل واضح ہو جاتا ہے اور اس
کے انداز بیان کا حسن موضوع سے گہری دلچسپی پیدا کر دیتا ہے۔
اس مضمون میں ایک مصورانہ رنگ ہے لیکن اس کے برعکس مولانا
ابوالکلام آزاد کے تعارف کی شکل دوسری ہو جاتی ہے، کیونکہ

یہاں ایک ہلکا سا تاثراتی انداز، ایک شخصی نقطۂ نظر بھی شامل ہو گیا ہے اور گفتگو میں ایک استدلالی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اب اسی کے بعد مجازؔ — کچھ یادیں کچھ باتیں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ لکھنے والا عقیدت اور عظمت کے تصورات سے الگ ہو کر مجازؔ کے پردے میں اپنے دل کے داغ بھی دکھانے لگا ہے۔ اس مضمون کا سوانحانہ نجی انداز، پُرلطف بیان، ذاتی واقفیت اور تعلق کا پُرخلوص جذبہ اسے افسانے کی طرح دلچسپ بنا دیتا ہے اور مجازؔ کا المیہ پُراثر انداز میں ذہن پر چھا جاتا ہے۔ فرحت اللہ انصاری نے مجازؔ کو خلوت اور جلوت میں، صحت اور بیماری میں، خوش حالی اور افلاس میں گویا ہر رنگ میں دیکھا تھا۔ اُن کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا، کوئی راز نہیں تھا، وہ ایک دوسرے کی تنقید بھی کرتے تھے، تعریف بھی، طنز بھی کرتے تھے، ہمدردی بھی، اس لئے اس مضمون میں ایک مخصوص رنگ کی انفرادیت ہے جو وہی پیدا کر سکتے تھے،

اس مجموعہ میں کئی مضامین ہندوستانی تہذیب کی ان خصوصیات سے متعلق ہیں جو مشترک عناصر کے حامل ہیں، جن کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ تہذیبی ارتقا ایک ہمہ گیر عمل ہے جس میں مختلف تہذیبوں کے جاندار پہلو شامل ہو کر ایک ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی

موسیقی اس ارتقائی عمل کی ایک زندہ مثال ہے اور اس موضوع پر فرحت اللہ انصاری نے جو دلکش، معلومات افزا اور سنجیدہ مضمون لکھا ہے وہ اس حقیقت کا ایک اہم ثبوت ہے کہ موسیقی میں جو ہندوستانی اور ایرانی دھاریں تھیں انھوں نے ایک نئے نظام موسیقی کو جنم دیا جو ایرانی عنصر کو جذب کر کے بھی ہندوستانی ہے۔ کدمبہ کی چھاؤں بھی ایک ایسی ہی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

ان چند مضامین کے موضوع کی جانب اشارہ کرنے کا مقصود یہ ہے کہ مجموعہ کے اکثر مضامین میں قومی تہذیب کی جو روح جاری و ساری ہے وہی درحقیقت اس پوری کتاب کا بنیادی موضوع ہے یعنی ادب اور تہذیب میں، ادب اور زندگی میں اور فنون لطیفہ اور انسانی معاشرے میں جو تعلق ہے اس کی جستجو ہمیں تنگ نظری اور عصبیت سے بچا سکتی ہے۔ ادبی حیثیت سے یہ مضامین شگفتہ نگاری کی حسین مثال پیش کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی اشاعت سے ہمارے ادبی خزانے میں اضافہ ہوگا۔

سید احتشام حسین (الہ آباد)

مہاتما کی جھلکیاں

۱۹۱۵ء کا زمانہ ہے۔ مہاتما گاندھی افریقہ سے واپس آرہے ہیں بمبئی کی بندرگاہ پر اخبار نویسوں کا اچھا خاصا مجمع ہے۔

ایک پارسی نوجوان جھپک کر آگے بڑھتا ہے۔ اس خیال سے کہ سب سے پہلے وہی گاندھی جی سے بات کرے۔ حسب دستور اس نے انگریزی میں سوال کیا۔ گاندھی جی نے سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے نرم و نازک لہجہ میں کہا۔

"آپ بھی ہندستانی، میں بھی ہندستانی۔ میری مادری زبان بھی گجراتی، آپ کی مادری زبان بھی گجراتی۔ پھر آپ مجھ سے انگریزی میں کیوں سوال کرتے ہیں؟

کیا آپ کا خیال ہے کہ میں جنوبی افریقہ میں رہ کر اپنی مادری زبان بھول گیا ہوں؟"

(۲)

گاندھی جی شانتی نکیتن میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ کل ہی آئے ہیں

آج پہلی صبح ہے۔

شانتی نکیتن کے لوگ جن میں اس زمانہ میں کاکا کیلکر بھی ہیں حسب معمول کام پر چلے جاتے ہیں۔ کام یہ ہے کہ شانتی نکیتن کی کٹیوں کے سامنے ایک تالاب ہے جسے وہ ہر صبح پاس کے ٹیلہ کو کھود کر پاٹتے ہیں، ایک گھنٹہ کی اس مشقت کے بعد جب پلٹتے ہیں تو ناشتہ تیار کرتے ہیں، کھاتے ہیں، پھر دوسرے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

آج یہ ٹولی پلٹی تو کیا دیکھتی ہے کہ پھل پھلاری سب قاعدہ سے کٹی بنی تھالیوں میں لگی ہوئی ہے۔

کاکا نے مہاتما جی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ائیں! یہ سب کس نے کیا ہے؟"

مہاتما جی نے جواب دیا "میں نے"

کاکا۔ "آپ نے! یہ تو اچھا نہیں لگتا، کہ آپ یہ سب کریں اور ہم لوگ بیٹھ کر کھائیں۔"

مہاتما۔ "کیوں؟ اس میں حرج ہی کیا ہے، تم کام پر گئے ہوئے تھے میں نے کہا میں اتنی دیر میں تمھارا ناشتہ ہی تیار کردوں۔"

(۳)

بمبئی میں ۱۹۱۵ء کی کانگریس ہو رہی ہے۔ گاندھی جی مارواڑی ودیالیہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں، ایک دن ان کو کہیں باہر جانا تھا انھوں نے اپنے ڈیسک کی چیزوں کو سلیقہ سے سمیٹنا شروع کیا۔ سب چیزیں رکھ لینے کے بعد

بھی وہ کسی چیز کو بڑے دھیان سے اِدھر اُدھر ڈھونڈھنے لگے۔ کاکا کالیلکر نے پوچھا۔

باپو۔ "آپ کیا ڈھونڈھ رہے ہیں؟"

باپو۔ "ایک پنسل ڈھونڈھ رہا ہوں، ننھی سی۔"

کاکا۔ لیجئے آپ یہ پنسل لے لیجئے۔ میں اس پنسل کو ڈھونڈھ کر رکھ لوں گا۔"

مقصد یہ تھا کہ باپو کا قیمتی وقت کیوں ضائع ہو۔ اور وہ بلا وجہ کیوں تھکیں۔

باپو نے کہا۔ "نہیں مجھے وہی پنسل چاہیئے۔ وہ مجھے ایک چھوٹے سے بچہ نے دی تھی۔ میں اسے کھو نہیں سکتا۔

کاکا بھی باپو کے ساتھ ڈھونڈھنے میں لگ گئے اور جب تک اس ننھے بچے کا وہ ننھا سا تحفہ مل نہیں گیا باپو کو چین نہیں آیا۔

(۴)

گاندھی جی نے گجرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جب گجراتیوں کو معلوم ہوا کہ گاندھی جی لسانی صوبوں کی تشکیل پسند کرتے ہیں تو کچھ لوگوں کو "گجرات راجکیہ پریشد" (گجرات پولیٹیکل کانفرنس) قائم کرنے کی سوجھی۔

گاندھی جی ٹھیک وقت پر کانفرنس پہنچ گئے۔

مہاراج تلک بھی مدعو تھے۔ وہ جیسا کہ اکثر ہوا کرتا تھا آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچے۔

گاندھی جی نے ان کا بڑے تپاک اور احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا مگر کہا:-

"لوک مانیہ آدھ گھنٹہ دیر سے آئے ہیں۔ اگر ہمیں سوراج لینے میں آدھ گھنٹہ اور لگا تو اس کا عذاب لوک مانیہ کے سر رہے گا۔

(۵)

۱۹۳۰ء کا زمانہ ہے۔ گاندھی جی یرودا جیل میں ہیں، میجر مارٹن جیل سپرنٹنڈنٹ گاندھی جی کے لئے فرنیچر اور برتن وغیرہ کا انتظام کر رہے ہیں۔ جب یہ چیزیں ان کے پاس پہنچنا شروع ہوئیں، تو گاندھی جی نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ "یہ سب کس کے لئے آ رہا ہے؟"

جیل سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا "آپ کے لئے۔ میں نے گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ اتنے بڑے معزز مہمان کے خورد و نوش کے لئے تین سو روپئے مہینہ کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اور مجھے امید ہے کہ گورنمنٹ اسے منظور کر لے گی۔

گاندھی جی نے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر میرا ماہانہ خرچ ۳۵ روپے سے زیادہ نہ ہوگا۔ مجھے اس سب سامان کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میری صحت ٹھیک ہوتی تو میں کھانا بھی سی کلاس کا کھاتا۔ اس لئے مہربانی کر کے یہ سب لوازمات ختم کیجئے۔ ساری کراکری واپس ہو گئی اور اسکی جگہ وہی تسلا اور کٹورا گاندھی جی کے لئے بھی آ گیا۔

(۶)

شام کی پرارتھنا ختم ہو چکی ہے۔ باپو تکیہ سے ٹیک لگائے اپنی چارپائی پر بیٹھے شری راوجی بھائی پٹیل سے باتیں کر رہے ہیں اتنے میں

اٹھیں اور ایک چادر کو دوہرا تہہ کر کے انھوں نے باپو کے شانوں پر ڈال دیا۔ باپو
انہماک سے باتیں کرتے رہے۔

تھوڑی دیر میں رو جی کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا سا کالا سانپ باپو کی پیٹھ سے رینگتے
ان کے داہنے شانے کی نوک پر آ گیا ہے اور ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے کہ اب کدھر
ے۔ رو جی کی نظر اس پر گڑ کر رہ گئی۔ دوسرا ہوتا چیخ اٹھتا اور نہ جانے کیا ہو جاتا۔

مگر رو جی بھائی پٹیل ان غیر معمولی آدمیوں میں تھے جن کے حواس کبھی نہیں جاتے
بھی ان کے سلسلۂ کلام میں اتنا فرق آ ہی گیا کہ باپو نے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ تمھارا
یان کہاں ہے؟"

رو جی نے نہایت آہستہ سے کہا۔

"کچھ نہیں باپو۔ بس اپنے ہی بیٹھے رہئے۔ آپکے شانے پر سانپ چڑھ آیا ہے"

باپو۔ "میں بیٹھا رہوں گا۔ مگر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟"

رو جی۔ "میں چاہتا ہوں کہ چادر معہ سانپ کے آپکے اوپر سے اٹھا کر پھینک دوں"

اتنی سی بات چیت سے بھی سانپ کو کچھ بھنک لگ ہی گئی۔ اس نے منہ پھیرا
ی تہہ میں جلدی سے غائب ہو گیا۔

رو جی اُٹھے تو باپو نے چپکے سے کہا۔

"میں تو بے حس و حرکت بیٹھا ہوں مگر تم اپنے کو بچائے رہو"

رو جی نے احتیاط سے کونے پکڑ کر چادر اتار لی اور جیسے ہی سانپ نے منھ
لا، انھوں نے اسے جھٹک کر دور پھینک دیا۔

سانپ کے بارے میں تو مشہور رہی ہے کہ اگر وہ کسی کے سر پر پھن کاڑھے

تو وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے روز جب اخبار نویسوں نے اپنی
جولانیٔ طبع دکھائی تو ایسی ہی قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔

خود کا کا کیلکر سے ایک صاحب نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"اگر وہ باپو کے شانے سے سر پر چڑھ جاتا تو باپو ضرور ہندوستان کے شہنشاہ
ہو جاتے"

باپو سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیا محسوس ہوا جب آپ کو پتہ چلا کہ سانپ آپکے
شانے پر چڑھ آیا ہے، تو انھوں نے کہا۔

"گھڑی بھر تو میں ڈرا۔ اس کے بعد خیال بھی نہیں ہوا"

(۷)

گاندھی جی برما کے چند روزہ دورہ سے واپس ہی ہوئے تھے کہ تار آیا
(فروری ۱۹۱۵ء) اور معلوم ہوا کہ گوکھلے جی اب نہیں رہے۔

گاندھی جی نے فوراً ہی یہ عہد کیا کہ آج سے سال بھر تک وہ ننگے پیر رہیں گے
اور پونا روانہ ہو گئے جہاں گوکھلے جی کا انتقال ہوا تھا۔

گوکھلے جی کی خواہش تھی کہ گاندھی جی ان کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں
شامل ہو جائیں۔ مگر گاندھی جی کو اس سوسائٹی سے پورا اتفاق نہیں تھا۔ اس لئے
وہ ان کی زندگی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔

جب گوکھلے جی مر گئے تو ان کی وہ خواہش گاندھی جی کے لئے ایک وصیت
سی ہو گئی۔ اس لئے انھوں نے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی ممبری کے لئے درخواست
دے دی۔

سوسائٹی بڑے چکر میں پڑ گئی۔ گاندھی جی کو ممبر بناتی ہے تو مشکل، اس لئے کہ وہ اپنے راستے سے تو ہٹیں گے نہیں اور ممبر نہیں بناتی ہے تو مشکل کہ گاندھی جی کی درخواست اور رد کر دی جائے۔

جب گاندھی جی کو سوسائٹی کی اس الجھن کا پتہ لگا تو انھوں نے اپنی درخواست واپس لے لی مگر اس کی سرپرستی کرتے رہے۔

(۸)

شنکر لال جی کا کہنا ہے کہ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ میں نے اور جیوت رام کرپلانی نے ہوم رول کا بڑا کام کیا ہے اور ہم لوگ بمبئی کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔

ایک دن ہم نے سنا کہ ایک آدمی گاندھی ہندوستان آیا ہے جو بہت کچھ کرنے والا ہے۔ خیال ہوا چلو اس سے ملیں اور دیکھیں کہ اس سے کہاں تک کام لیا جا سکتا ہے ہم لوگ گئے۔ گاندھی جی زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے کرسیاں گھسیٹیں، بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے — نہ پوچھئے کیسے سرپرستانہ لہجہ میں گفتگو کی ہے۔

مگر جب نکلے تو محسوس ہوا ہم اس سے بہت متاثر واپس آئے ہیں۔

پیکرِ عظمت ___ مولانا آزاد

مولانا آزاد ایک ایسی جامع العلوم ہستی تھے کہ اُن کے علم و فضل کے بیان کے لیے ہندوستان کے گوشے گوشے سے علماء و فضلا کا ایک زبردست اجتماع کرنا پڑے گا، پھر بھی بعض پہلو شاید تشنہ ہی رہ جائیں، اس لیے کہ امیر خسرو کے بعد مولانا آزاد ہی وہ بزرگ ہوئے ہیں جو شعر و نغمہ سے لے کر رشد و ہدایت تک ہر شعبہ زندگی میں اپنے نقش قدم چھوڑ گئے ہیں۔ ایک شعبہ یعنی وطنیت میں تو اُن کا درجہ امیر خسرو سے بھی بلند ہے۔ اس لیے کہ حُب وطن اور مشترکہ قومیت کی تشکیل کا سہرا امیر خسرو ہی کے سر ہے، مگر وطن کی خاطر مصیبتیں اور صعوبتیں اٹھانے نیز قومیت کی تشکیل کو تکمیل تک پہنچانے کا فخر مولانا آزاد ہی کا حصہ ہے۔

مولانا نے اس امتحان گاہ میں ایسی پامردی اور استقلال کے ثبوت پیش

کہے ہیں کہ آنے والی نسلیں ہمیشہ ان پر فخر کرتی رہیں گی جب بھی صداقت اور استواری کا معاملہ چھڑے گا مولانا کی ہستی سورج کی طرح آسمان سے چمکتی نظر آئے گی۔

خدا نے مولانا آزاد کو ایک ایسے محترم و متقدر گھرانے میں پیدا کیا تھا کہ اگر ان کے مزاج میں ذرا بھی تن آسانی ہوتی تو وہ دُنیا کی ساری نعمتیں خصوصاً قیادت اور سرداری کی نعمت جس کے لیے دُنیا میں کیا نہیں ہوتا گھر بیٹھے حاصل کر سکتے تھے، جو لوگ پیر اور پیرزادوں کی فرماں روائیوں سے ناواقف ہیں وہ شاید حیرت کریں مگر جنھیں آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کے مسلم معاشرے کا صحیح اندازہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں ہندوستان میں پیرانِ کرام کا کیا اقتدار تھا۔ آج بھی ہندوستان کے بعض حصّوں اور بیرونِ ہند کے بہت سے خطّوں میں پیروں کا سکہ چلتا ہے، پھر مولانا آزاد تو ایک ایسے پیرِ طریقت کے صاحب زادے تھے جو اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا حلقۂ ارادت اتنا وسیع تھا کہ نہ صرف کلکتہ و بمبئی کے مسلم تاجر بلکہ غیر مسلم تاجر بھی اس میں شامل تھے۔ ان بے شمار مریدوں اور ان کی بے حساب دولت پر حکمرانی کے لیے مولانا آزاد کو کسی سعی کی ضرورت نہ تھی۔ مخلصین و معتقدین اپنے مرشد زادے کی چشم و ابرو کی جنبشوں پر مال تو مال جان تک نثار کر دینا اپنا فرض جانتے تھے۔ مگر مولانا کی طبع آزاد نے اس حلقۂ اخلاص و ارادت کی اسیری بھی قبول نہ کی۔ انھیں خود اپنے بزرگوں کا تتبع بھی پسند نہ آیا اور انھوں نے شہ نشینی چھوڑ کر سرفروشی کی راہ نکالی۔

پڑھنے کو مولانا آزاد نے وہی کتب درسیہ پڑھی تھیں جو اُستاد الہند ملا نظام الدین کے وقت سے رائج ہیں اور اس میں بھی انھیں یہ ملال رہا کہ وہ مشاہیرِ ہند سے تحصیل علم نہ کر سکے۔ مگر ان کے ذہنِ رسا کے لیے خدا نے انہی کتابوں میں وہ دفترِ معنی کھول دیا تھا جو دوسروں کو ساری دُنیا کی خاک چھاننے کے بعد بھی مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔ غالباً یہ بھی قدرت کا ایک انتظام تھا کہ ان کا نام کسی اہم با شان درس گاہ یا معلم سے نہیں وابستہ ہوا، اور آج وہ اپنے علم و فضل میں ہمیں کسی غیر کے رہینِ منت نہیں نظر آتے۔

کہتے ہیں کہ مولانا آزاد صرف چودہ پندرہ برس کے سن میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے اور انھوں نے درس دینا شروع کر دیا تھا لیکن یہ کوئی محیر العقول بات نہیں اس کی مثالیں علمائے ہند میں اور بھی مل سکتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور محیر العقول ہے کہ مولانا نے ایک محدود اور مخصوص فضا میں تعلیم پانے اور پروان چڑھنے کے بعد وہ اہلیت و جامعیت پیدا کی جس کی مثال میں دوسرا نام پیش کرنا مشکل ہے۔ عام طور پر انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوا کرتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسی بھی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں جو اس ماحول ہی کو بدل دیتی ہیں اس فضا ہی کو بدل دیتی ہیں اور اُس عالم ہی کو بدل دیتی ہیں جس میں وہ آنکھیں کھولتی ہیں۔ مولانا آزاد دُنیا کی انھیں چند ہستیوں میں ہیں۔ شریعت و طریقت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی رشد و ہدایت نے ان کو اپنی گودوں میں کھلایا تھا، وہ مفسرِ قرآن ہوئے تو کیا حیرت کی بات ہے، وہ امام الہند ہوئے تو ان کی عزت میں کیا اضافہ ہو گیا۔ ہاں یہ ضرور حیرت کی بات ہے کہ وہ دُنیا کے سامنے آئے تو صحافت سے

جدید فن کو لے کر انھوں نے اپنی زندگی کی ابتدائی تربیت وراثت سے نہیں جو انھیں
ورثے میں ملی تھی، وطن پروری قوم پروری ہے جس کا مفہوم سمجھانا سمجھنے والے بھی
چند ہی تھے، قدر و منزلت کرنے والوں کا تو ذکر ہی کیا۔ جو ورثہ اور ترکہ کو اس طرح
چھوڑ سکے، جو دولت و ثروت سے منھ موڑ سکے اور جو رسم و روایات اور ظلم و
تعدی سے اس طرح نمٹ سکے جیسے مولانا آزاد، اس کی عظمت کے گیت دنیا
ہمیشہ گاتی رہی ہے اور ہمیشہ گاتی رہے گی۔ جس طرح حقانیت اور روحانیت کی
تاریخ میں ہم آج گوتم بدھ کے نام پر گردنیں جھکا دیتے ہیں اسی طرح وطنیت اور
قومیت کی تاریخ میں جب مولانا آزاد کا نام آئے گا تو صدہا سال گزر جانے
کے بعد بھی دنیا اپنا سر جھکا لیا کرے گی۔ مجھے مولانا کی عالمانہ عظمت کا احساس
سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ مسلم لیگ شروع ہو چکی تھی، لکھنؤ کے ایک مرکز
سیاست میں کسی صاحب نے مولانا آزاد کا نام صرف مولوی کہہ کر کہا۔ کچھ ہی
دور حسرت موہانی اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی میں باتیں ہو رہی تھیں جیسے ہی
موخر الذکر کے کان میں آواز پڑی انھوں نے سلسلۂ کلام قطع کر دیا، اور انتہائی
ناراضگی سے کہا

"وہ مولوی کہلائیں تو کیا آپ مولانا کہلائیں گے"

ایک سناٹا سا چھا گیا اور ان حضرت کو معذرت ہی کرتے بنی۔

اسی سال اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سلسلے میں کلکتے جانا ہوا۔ نوجوانوں کا
سیاسی شعور اس وقت شباب پر تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی فضا اتنی صحت مند
تھی کہ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر جن میں سے ایک کا انتقال ہو چکا ہے

اور دوسرے پاکستان جا چکے اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود طلبا کی وطن پرست
جماعت کا اثر نہیں توڑ پائے۔ وہ اپنی پسند کے ایک طالب علم کو یونین کا سکریٹری
بنوانا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے عین الکشن کے دن ایک حکم امتناعی جاری
کیا، اور سکریٹری شپ کے قوم پرست امیدوار کی نامزدگی مسترد کر دی، طلبا نے
اس کے جواب میں سرکاری امیدوار کو زبردست اکثریت سے ہرا دیا۔ اور مسلم
یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی بار ایک بی، اے سے کم درجے کا طالب علم جو صرف فاق
میں ٹھہرا کیا گیا تھا یونین کا سکریٹری منتخب ہو گیا۔ ولی دادان سرکار انگلشیہ کو بڑا
طیش آیا، اور انھوں نے ایک مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کرنے کی تجویز کی۔ یہ
کار نیک انیس صاحب کے سپرد کیا گیا جو الکشن میں ہارے تھے۔ سارے ہندوستان
میں دورہ کرنے کے بعد انھیں کلکتے میں صرف یہ امید ہوئی کہ وہ مسلم اسٹوڈنٹس کے
نام پر اجتماع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہاں بڑے پیمانے پر تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس
فتنے کے انسداد کے لیے ایک وفد لکھنؤ سے بھی روانہ ہوا، جس میں انصار ہروانی
جو اب ایم۔ پی ہیں پیش پیش تھے، وہاں پہنچ کر یہ وفد سرت چندر بوس سے ملا۔
سرت بابو نے کہا آپ کے جلسے کی کامیابی کی صرف یہ صورت ہے کہ مولانا صاحب
شرکت کا وعدہ کر لیں۔ وفد نے کہا تو آپ مولانا سے کہہ دیجیے۔ سرت بابو نے جواب
دیا "نا بابا! مولانا صاحب سے کوئی نہیں کہہ سکتا، گاندھی جی بھی ان کا منھ تکتے
ہیں"۔ جب سرت بابو سے بہت اصرار کیا گیا بلکہ وفد نے ان کو عاجز کر دیا تو انھوں
نے کئی مرتبہ جرأت کرنے کے بعد خود ٹیلیفون اٹھایا۔ ۲۱ برس گزر چکے ہیں ایک
نسل بوڑھی ہو چکی ہے، دوسری نسل جوان ہو چکی ہے، آزادی جو ایک خواب

تھا حقیقت بن گئی ہے، مولانا جن کی عظمت کا چرچا ہو رہا ہے اللہ کے پیارے
ہو چکے ہیں، مگر سرت بابو کی وہ کیفیت آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ ٹیلیفون پر
ہاتھ رکھے جاتے تھے اور ہٹا لیتے تھے جیسے ریسیور کرنٹ مار رہا ہو۔ اللہ! اللہ!!
ایک ہم عصر کے دل میں دوسرے ہم عصر کے لیے یہ احترام، یہ عزت۔ وفد کے
نوجوان دیکھ رہے تھے، حیران ہو رہے تھے اور سبق لے رہے تھے۔ ٹیلیفون مل گیا
باتیں شروع ہوئیں۔ سرت بابو نے اتنا تو کہا "یو۔ پی سے کچھ نوجوان آئے ہیں
کانفرنس کر رہے ہیں، آپ سے۔ ۔ ۔" اس کے بعد وہ جی جی کرتے رہے اور
قصہ ختم ہو گیا۔ اس مایوسی کے عالم میں سرت بابو نے یہ مشورہ دیا کہ آپ لوگ گروپ
بنا کر جائیے اور مولانا سے خود کہیے۔ وہ سمجھیں گے تو آئیں گے۔

دوسرے دن پہلے گروپ کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف
حاصل ہوا۔ جتنی دعائیں یاد تھیں سب راستے میں پڑھ ڈالیں۔ جو کچھ کہا جا سکتا
تھا اچھی طرح سوچ ڈالا، مولانا کو اطلاع کرائی۔ وہ تشریف لائے اور میں اس
پیکرِ عظمت و وجاہت کے قدموں میں بیٹھ گیا، اصطلاحاً نہیں واقعتاً۔ اس لیے
کہ مولانا پیروں میں موچ ہونے کی وجہ سے کرسی پر تشریف فرما تھے جو سارے کمرے میں
ایک ہی تھی اور ہم لوگ قالین کے فرش پر بیٹھے تھے۔ عرضِ مدعا کیا۔ مولانا نے
اس توجہ سے سنا کہ بڑی اُمید ہو گئی۔ پھر ایسے لہجے میں لب کشائی کی کہ اور بھی
اُمید بندھ گئی، فرمایا۔

"میں نہ گیا تو آپ کی کانفرنس ناکام ہو جائے گی؟"
میں نے بڑی بے تابی سے عرض کیا "جی ہاں!"

اُنھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اسی لہجے میں کہا

"اور آپ کے دل ٹوٹ جائیں گے، آپ اپنے گھروں کو واپس چلے
جائیں گے، تو میرا بھائی آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ اس وحشت نگر
میں قدم رکھیں۔ یہاں تو ناکامیوں پر ناکامیاں دیکھنا پڑیں گی شکستوں
پر شکستیں کھانا پڑیں گی، تب کہیں منزل کا نشان ملے گا۔ میں آپ کا
سہارا لینا چاہتا تھا، آپ مجھ بڈھے کو سہارا بنا رہے ہیں۔ میری
پہ شکستگی سب کو معلوم ہے، میں کہیں نہیں جاتا۔"

مولانا کے ان نپے تلے جملوں نے ایسا لاجواب کیا کہ وفد کی ساری گویائی سلب
ہو گئی، مگر دل میں ایک نئی اُمنگ پیدا ہو گئی۔

۱۹۳۶ء کے بعد مولانا سے ۱۹۴۷ء میں نیاز حاصل ہوا جب لکھنؤ میں مسلم
کنونشن ہوا ہے۔ آزادی مل چکی تھی، دُنیا بدل چکی تھی، مگر فرقہ پرستی نے وہ گل
کھلایا تھا، حاکم کی سیاست نے وہ شعبدہ دکھایا تھا کہ عقلیں حیران تھیں۔ مولانا
کی زندگی میں یہ دس سال خاص اہمیت کے حامل تھے۔ ایک طرف قوم پرست
تھے جو انھیں خاص عزت و احترام کے ساتھ میرِ کارواں بنائے ہوئے تھے، دوسری
طرف فرقہ پرست تھے جو اسی شد و مد کے ساتھ انھیں اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔
بے لوث اور بے باک مولانا ایک پیکرِ استقامت کے ساتھ حق گوئی اور حق نمائی
میں لگے رہے۔ بعض جوش میں اندھے مسلمانوں نے گستاخیاں بھی کیں، بدتمیزیاں
بھی کیں مگر مولانا کی زبانِ مبارک سے ایک لفظ بھی کسی کے لیے بُرا نہیں نکلا۔
اس عفوِ خطا کی انتہا یہ بھی کہ جب کنونشن کے سیاسی پلیٹ فارم سے مولانا نے مسلمانوں

و آخری بار خطاب کیا تھا اُس وقت بھی اُن کے لہجے میں تلخی نہ تھی۔ اُن کا دل
نج وغم سے چور تھا مگر اُن کے چہرے پر غصّے یا انتقام کے آثار نہ تھے۔ اس ترحم
خسروانہ نے شرم سار مسلمانوں کو مولانا کا بندۂ بے دام بنا لیا، اور آج جب وہ
پردہ کر چکے ہیں تو اُن کے ماننے والے ہی اشک بار نہیں ہیں وہ بھی سینہ فگار ہیں
جو کسی وقت اُن کو بُرا کہتے تھے۔

خطابت وصحافت، سیاست وفراست اور دیانت وصداقت کی وہ
تمام خوبیاں جو دوسروں کے حصے میں آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی مولانا کی ذات
گرامی میں بیک وقت جمع ہو گئی تھیں۔

پُرانے ہند کا انصاف

"ذیل کا مضمون ہندوستانی کلچر سوسائٹی الہ آباد کے پرچے "نیا ہند"
سے لیا گیا ہے جو خالص اُردو میں نہیں بلکہ "ہندوستانی" زبان میں
لکھا گیا ہے۔ ہم اسے اسی زبان میں درج کرتے ہیں" (الجمعیۃ)
یہاں بھی یہ بجنسہٖ نقل کیا جا رہا ہے۔

بہت دنوں کی بات ہے۔ اتنے دنوں کی بات ہے کہ سن و سال کا ٹھیک کرنا
بھی مشکل ہے۔ لیکن بات پکّی ہے۔ آپ کہیں گے ایسی کون بات ہے جس کی دن
تاریخ بھی نہیں بتائی جا سکتی۔ مگر ہے پکّی۔ جی ہاں! ہند اور عرب کا میل جول
ہندوؤں اور مسلمانوں کی جان پہچان اتنی ہی پُرانی بات ہے۔
جو تاریخ ہم عام طور سے پڑھتے رہے ہیں بلکہ جو ہمیں پچھلے سو ڈیڑھ سو سال
سے پڑھائی جا رہی ہے اُس کے مطابق ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہندا بیر ہی

رہا ہے یہ اتہاس زیادہ سے زیادہ آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم کے سمندری حملے سے نہیں تو عام طور پر تیرھویں صدی میں محمود غزنوی کی لوٹ مار سے شروع ہوتا ہے اور ہر پڑھنے والے کے من پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ ہند اور ان ملکوں میں جو آج اسلامی ملک کہلاتے ہیں، اسلام سے پہلے تو کوئی سمبندھ ہی نہیں تھا، اور اسلام کے بعد ہوا بھی تو وہ سمبندھ جو راجا اور پرجا یا ظالم اور ظلم سہنے والے میں ہوا کرتا ہے۔

لیکن ہماری اپنی کتابیں بتاتی ہیں کہ ان حملوں سے پہلے کم سے کم تین چار صدیاں ایسی بیتی ہیں جن میں ہند، ایران اور عرب میں خالص دوستی اور پریم کا سمبندھ رہا ہے اور اس میں اسلام سے پہلے کا بھی زمانہ شامل ہے اور اسلام کے بعد کا بھی۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ

"جب ایران کا بادشاہ دارا تھا اس سمے ہند کا بیوپار ایرانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ پانچویں، چھٹی صدی میں تو یہ بیوپاری سمبندھ اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔"

ایرانیوں کی طرح عرب بھی اسلام کے بہت پہلے سے ہند کے پچھمی اور پوربی بندرگاہوں پر آیا کرتے تھے اور رہا کرتے تھے۔ عرب اور ہند میں دو طرح کا رشتہ تھا۔ ایک تو سیدھا یعنی اس بیوپار کی بنا پر جو عرب اور ہند میں ہوتا تھا دوسرا چین عرب کے بیوپار کے کارن، جس کے لئے ہند کے بندرگاہوں پر رکنا اور ٹھہرنا لازمی تھا۔

چین میں سب سے پہلا مسلمان سمندری راستے سے [illegible]ء میں پہنچا تھا۔
اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہند میں عرب جہازوں کا آنا جانا اس کے پہلے سے ضرور رہا تھا۔ جب وہ ہند کے سمندری کناروں کو اچھی طرح جان گئے ہوں گے تب ہی اور آگے چین کی طرف بڑھے ہوں گے۔ آج ہم ان ملکوں یا جہازیوں کو جو ہمارے سمندری کناروں پر اڈے بنانا چاہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ کوئی بھی دیش کسی دوسرے دیش کو یہ رعایت ہنسی خوشی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اب سمندری جہازوں کا چلنا چلانا عام ہو گیا ہے پر اس زمانے میں ایسا نہ تھا، بلکہ اس کے برعکس جن ملکوں کے جہاز ہند کے سمندری کناروں پر اپنے اڈے بنانا چاہتے تھے انھیں بڑی بڑی رعایتیں دی جاتی تھیں۔ راجا اور پرجا دونوں ان جہازوں کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آتے تھے کیونکہ ان سے سب کو فائدہ پہنچتا تھا، اس لیے عرب جہازی بھی طرح طرح کی رعایتوں کے ساتھ جن میں زمینیں خریدنے اور بیوپار کرنے کے علاوہ دھرم کا پرچار بھی شامل تھا۔ ہند کے پچھمی اور پوربی کناروں پر آباد ہونے لگے۔ ان میں ٹراونکور اور زمورن کی ریاستوں کے بارے میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کی سب سے زیادہ قدر ہوتی تھی۔ زمورن نے عرب جہازیوں کو [illegible] دینے اور اپنے یہاں جہاز چلانے کا شوق پیدا کرنے کی بھی کوشش کی، لیکن دھارمک بندھنوں کے کارن ہندو جیسے اس کے لیے تیار نہیں ہوئے، آخر زمورن نے اپنے راج میں یہ حکم جاری کیا کہ مچھیروں کے ہر خاندان سے کم سے کم ایک لڑکے کی تربیت (شکشا دکشا) مسلمان کی حیثیت سے کی جائے۔

"پچھمی سمندری کنارے کی طرح پوربی کنارے پر بھی عربوں کا آنا جانا اسلام کے آنے سے پہلے کے سمے سے تھا۔ اسلام کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ پوربی کنارے پر عربوں کی سب سے بڑی بستی ضلع تناولی میں کایل پٹانم کے مقام پر تھی جہاں ساتویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی عیسوی تک کے اسلامی سکے پائے گئے ہیں۔"

(ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب ص۲۵۲)

جب ساتویں صدی میں اسلام نے عربوں میں ایک نئی روح پھونک دی، اور ان کے الگ الگ قبیلوں کو آپس میں ایک کر دیا تو ان کی سلطنت بھی پھیلنا شروع ہوئی اور بیوپار بھی بڑھنے لگا۔ ایران کو جیتنے سے وہ سارا سمندری بیوپار جو ایرانیوں کے ہاتھ میں تھا عربوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ہند بھی ایران کی طرح فتح کیا جائے۔ لیکن اسلام کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر نے سختی کے ساتھ منع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایک بڑی جیت کے بعد سمجھ داری کی بات یہی تھی کہ دوسری جیتوں کے پیچھے عرب فوراً نہ دوڑ پڑیں۔ اس لیے خلیفہ عمر کے حکم سے آگے کی فوجی کارروائیاں رک گئیں اور عرب ہند میں صرف بیوپاری بن کے رہ گئے جو برابر بڑھتے گئے۔

عرب مسلمانوں نے بیوپاریوں کی حیثیت سے دکھنی ہند اور لنکا کے سمندری کناروں پر اپنی بستیاں بسا لیں، ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کر لیں اور اس طرح رہنے لگے جیسے کوئی تجارتی قافلہ ایک اچھی منڈی میں بس جاتا ہے۔

ہمارا مقصد تاریخ بیان کرنا نہیں بلکہ اُس سمے کی ایک دلچسپ گھٹنا پر روشنی ڈالنا ہے جب کہ مسلمان بہت ہی تھوڑی گنتی میں اور صرف بیوپار کی غرض سے یہاں رہا کرتے تھے۔ اِس گھٹنا کو عربی کے اتہاس کار محمد عوفی نے بیان کیا ہے اور اُردو کے مشہور لیکھک مولانا شرر لکھنوی نے ۱۹۱۲ء میں "ایک ہندو راجا کا انصاف" کے نام سے اپنے مشہور ماہانہ رسالہ "دلگداز" میں چھاپا ہے۔

مولانا شرر لکھتے ہیں :- جب ایران کو مسلمانوں نے جیت لیا تو بہت سے ایرانی بھی پچھمی ہند کے سمندری کناروں پر آ بسے۔ اِن کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے جو عناد (دویش) ہونا چاہیے تھا اس کا کارن ظاہر ہے وہ اپنے دیش میں تو جیت نہیں پائے تھے اس لیے خار کھائے بیٹھے تھے۔ ایک دن ان ایرانیوں نے کھمبات بندرگاہ میں عرب مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انھوں نے اذان کے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلانا شروع کیں اور آس پاس کے ہندوؤں کو بھڑکا کر مسلمانوں پر ایسا حملہ کیا کہ سوائے خطیب علی کے جو کھمبات کی مسجد کا امام تھا جتنے مسلمان آس پاس رہتے تھے سب مار ڈالے گئے۔

خطیب علی وہاں سے بھاگ کر نہروالا پہنچا جو راجہ کی راجدھانی تھی۔ راجہ اپنے نیائے اور انصاف کے لیے بہت مشہور تھا، اور اس کی عملداری اتنی بڑی تھی کہ سارے گجرات دیش میں اسی کا سکہ چلتا تھا۔ نہروالا میں خطیب علی نے بہت سے حاکموں سے فریاد کی پر کسی نے دھیان ہی نہ دیا کہ ایک معمولی سی مسلم

آبادی پر بلاوجہ حملہ کر دیا گیا اور ان کی مسجد توڑ ڈالی گئی۔ آخر اس نے راجا
تک پہنچنے کی کوشش کی پر اس کے لیے بھی کوئی راستہ نہ نکلا۔ ایک دن اُسے
معلوم ہوا کہ مہاراج شکار پر جا رہے ہیں وہ راستے میں چھپ گیا اور جیسے ہی
مہاراج کا ہاتھی اس کے پاس سے گزرا وہ جھاڑیوں سے نکل کر باہر آیا اور چیخا
" دہائی ہے مہاراج کی۔"

راجہ نے جھٹ اپنا ہاتھی روک لیا اور پوچھا۔ "اے اجنبی تو کون ہے،
اور کیا چاہتا ہے؟"

خطیب نے جواب دیا "میں ایک ستایا ہوا مسلمان ہوں، اور انصاف
چاہتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی خطیب نے اپنے لمبے کُرتے کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اُسے
دونوں ہاتھ پر رکھ کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

راجہ نے کہا "ہم انصاف میں ایک منٹ بھی دیر نہیں کرتے، تمہیں جو
کچھ کہنا ہو فوراً کہو۔"

خطیب نے عرب پیرا روایات کے مطابق اشعار، فوراً ایک قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔
مولانا شرر لکھتے ہیں "یہ قصیدہ سنسکرت میں تھا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے
عربوں کی دوستی بہت پرانی دوستی تھی اور جو عرب یہاں رہتے تھے وہ یہاں کے
علم و فن میں بھی کافی دخل رکھتے تھے۔

راجہ پر خطیب کے قصیدے کا بہت اچھا اثر پڑا۔ اس نے اپنے ساتھ کے وزیروں
سے پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے؟"

وزیروں نے کہا۔ "ہم میں سے کسی کے کان تک یہ خبر نہیں پہنچی ہے، ہم
کیسے یقین کر لیں کہ یہ اجنبی سچ کہتا ہے؟"

راجہ نے کہا۔ "فریادی! ہم اپنا شکار ملتوی کرتے ہیں اور واپس ہوتے
ہیں، مگر تمہارے بیان میں ذرا بھی جھوٹ نکلا تو اچھا نہ ہوگا۔"

وزیروں نے کہا۔ "مہاراج اس میں کوئی ایسی بات تو نہیں ہے کہ سرکار
اپنا شکار ملتوی کر دیں۔"

راجہ نے جواب دیا۔ "انصاف میں دیر کرنا انصاف کا خون کرنا ہے،
فریادی کو ساتھ لو اور واپس چلو۔"

سارا قافلہ واپس ہو گیا۔ راجہ نے نہروالا پہنچتے ہی دربار لگایا، اور
بڑے سے چھوٹے تک ہر ایک کو یہ حکم دیا کہ اس معاملے کی تحقیقات کی جائے،
اور تین دن کے بعد مجھے خبر دی جائے اس وقت تک میں محل سے باہر نہ آؤں گا۔"
جمعے کے دن پھر دربار ہوا تو بڑے وزیر نے یہ رپورٹ دی کہ تفصیل نہیں معلوم
ہو سکتی، بس اتنا پتہ چلا کہ پارسیوں اور مسلمانوں میں کسی بات پر اَن بن ہو گئی تھی
کس نے پہل کی اور کس پر ظلم ہوا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

راجا نے خطیب کو حکم دیا کہ وہ اپنا سارا مقدمہ دربار میں پیش کرے۔ جب
وہ اپنی فریاد سنا چکا، تو ہر وزیر نے اپنی اپنی رائے دی۔ کسی نے کہا "یہ جھوٹا ہے"؟
کسی نے کہا "اس کا اعتبار ہی کیا؟" اکثر نے کہا "یہ کیسے مان لیا جائے کہ کہا

ے لوگ آپ ہی آپ بگڑ گئے، اور ایسی بے رحمی پر اتر آئے کہ جو مسلمان ان کی
ناہ میں تھے اُن پر بھی ٹوٹ پڑے۔

راجہ نے کہا — "بے شک یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کھمبات کے ہندو
پ ہی آپ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ مگر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہاں کے
سلمان رہے سہے پاگل ہو گئے، اور ان ہی ہندوؤں سے اُلجھ پڑے جو انھیں
ناہ دیے ہیں۔"

بڑے وزیر نے کہا — "جب تک گواہی نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔"

راجہ نے اشارہ کیا اور ایک صراحی اُس کے سامنے لاکر رکھ دی گئی۔

راجہ نے کہا — "بے شک ناممکن ہے۔"

بڑے وزیر نے فریادی سے پوچھا — "کوئی گواہی پیش کر سکتے ہو؟"

راجہ نے کہا — "ظلم کے خلاف ذرّہ ذرّہ شہادت دے سکتا ہے۔ یہ کاش
و ہے، یہ دھرتی گواہ ہے اور یہ صراحی گواہ ہے، تو اس کا پانی پیو اور بتاؤ
یہ کیا کہتا ہے؟"

جس جس نے صراحی کا پانی پیا وہ منھ بنا کر رہ گیا۔ اور لوگ تو نہیں سمجھے
ں نے کہا کڑوا ہے، کسی نے کہا کھاری ہے۔

بڑا وزیر سمجھ گیا — اُس نے کہا — "مہاراج سچ کہتے ہیں، یہ کھمبات کا پانی
ہے اور اس کی گواہی بالکل سچی ہے۔"

دوسرے وزیر یہ سُن کر حیران رہ گئے۔

راجہ نے کہا — "اس میں حیرانی کی کیا بات ہو، سچ مچ یہ کھمبات کا پانی

ہے، میں خود اسے سمندر سے بھر کر لایا ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں
کہ جو کچھ اس فریادی نے کہا ہے اس کا ایک ایک حرف سچ ہے۔ میں نے یہ
تین دن اسی لیے دیے تھے کہ دیکھوں تم میں سے کون ہے جو کھمبات جاتا ہے
اور ٹھیک ٹھیک پتہ لگا کر آتا ہے۔ مگر افسوس ایک نے بھی گشت نہ کیا۔ مجھے
ٹوٹی ہوئی مسجد دیکھ کر اتنا دکھ نہیں ہوا جتنا یہ سوچ کر دکھ ہو رہا ہے کہ میرے
وزیر کتنے آرام طلب ہیں اور راج پاٹ کی طرف سے کتنے بے خبر ہیں۔"

سارا دربار یہ سُن کر دنگ رہ گیا کہ راجہ ان تین دنوں میں نہروالا سے
کھمبات گیا اور واپس آ گیا، سب نے اپنی اپنی گردنیں شرم سے جھکا لیں۔

راجہ نے کہا — "یہ ساری شرارت پارسیوں کی ہے۔ وہ وہاں (ایران)
کا بدلہ یہاں کے مسلمانوں سے لینا چاہتے ہیں، مگر یہاں کا مسلمان میری رعایا
ہے اور میری رعایا پر ہاتھ اُٹھانا میرے راج کے ساتھ گستاخی کرنا ہے۔ ہندو
بھی خطاوار ہیں کہ وہ دوسروں کے بھڑکانے میں آ گئے، آخر یہ کیوں بھول گئے اس
لیے ہندوؤں اور پارسیوں کے دو دو سرغنہ حاضر کیے جائیں، ٹوٹی ہوئی مسجد
نئے سرے سے بنائی جائے اور فریادی کو خلعت دے کر سرکاری انتظام میں
یہاں سے کھمبات پہنچا دیا جائے۔"

مولانا شرر لکھتے ہیں:—

"اُس سنے کے ایک دو برس بعد وہ مسجد بہت ہی بڑے
پیمانے پر اور بہت ہی شان دار دوبارہ تعمیر ہوئی، اس میں اذان
کے لیے بہت ہی خوب صورت اور مضبوط مینار قائم کیا گیا اور

وہ خلعت جو راجہ نے خطیب علی کو دیا تھا مسلمانوں میں پُرانے تبرک (پرساد) کی حیثیت سے رکھا رہا، جسے وہ عید و بقرعید کی سی خوشی کے موقع پر نکالتے تھے اور زیارت کرنے کے بعد پھر حفاظت سے رکھ دیتے تھے۔"

(نیا ہند سنہ ۴۸ء)

فاشزم کے روپ

فاشزم کوئی سیاسی یا معاشی نظریہ نہیں ہے۔ یہ ایک طریقِ عمل ہے جو مختلف حالات میں مختلف صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ مسولینی ۱۹۳۲ء میں اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے: "جب جنوری ۱۹۱۹ء میں میں نے فاشسٹ ریولیوشنری پارٹی قائم کی تو میرے ذہن میں کوئی واضح لائحہ عمل نہیں تھا۔" پانچ چھ سال تک فاشزم کی تحریک بلا کسی نظریہ اور بلا کسی واضح لائحہ عمل کے چلتی رہی۔ جب اس منفیانہ گروہ نے اتنی حیثیت حاصل کر لی کہ وہ دوسری جماعتوں کے مقابل آ سکے تو اُسے ایک نظریہ اور فلسفہ کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں کانگریس کی تیاری کے سلسلے میں مسولینی نے اپنے رفقاء بیں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک مکتوب میں لکھا۔

"اب اطالوی فاشزم اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں اُسے اپنی موت و زیست کے لیے ان ہی دو مہینوں میں ایک واضح نظریہ تیار کر لینا چاہیے۔ کانگریس اجلاس کے وقت تک یہ نظریہ ضرور تیار ہو جائے۔"

(مسولینی، مطبوعہ میلان صفحہ ۲۹)

بادشاہی فرمائش خالی نہیں گئی۔ دو مہینے کے اندر ہی اندر ایک فلسفہ بھی وضع

کرلیا گیا۔ اور ایک نظریہ بھی تیار ہوگیا۔

بظاہر یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ اٹلی کی فاشسٹ ریولیوشنری پارٹی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک بلا کسی نظریے اور بلا کسی لائحہ عمل کے کیسے چلتی رہی، ایک خالی الذہن شخص کیسے اس کی قیادت کرتا رہا اور آگے بڑھتا رہا، مگر ہوا یہی۔

مسولینی نے اپنے ملک کی بے چینی سے فائدہ اٹھایا۔ جنگ عظیم کے بعد اٹلی میں ایک عام ناراضگی تھی کہ اتحادیوں کی فتح سے اٹلی کو کچھ نہیں ملا تھا۔ یہ ناراضگی معاشی الجھنوں سے بڑھتی گئی۔ تجارت ٹھپ تھی۔ کارخانے سامانِ ضروریات کی تیاری سے قاصر تھے۔ افراطِ زر بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ملک کا دیوالہ ہی نکلنے والا تھا۔ اربابِ حکومت میں پھوٹ پڑی تھی۔ غرض مصیبتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ اور اُن کے حل کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی۔ ایسی حالت میں مزدوروں نے ہڑتالیں شروع کیں۔ شمال اور وسط اٹلی میں جہاں مزدور کمیونسٹوں کے اثر میں تھے متعدد ہڑتالیں ہوئیں۔ اور بعض کارخانوں پر مزدوروں نے قبضہ بھی کرلیا۔ مسولینی نے ان ہڑتالوں اور زبردستی قبضے کی پُرزور حمایت کی۔ چنانچہ جب ۱۹۱۹ء میں مسولینی نے پہلی بار اپنی فاشسٹ پارٹی (مسلح دستہ) تیار کیا تو اس کی بنیاد سوشلسٹ پروگرام پر رکھی تھی، اور حسب ذیل مطالبات پیش کیے تھے۔ پارلیمانی اصلاح، عام حق رائے دہندگی، جاگیرداری کا خاتمہ، مزدوروں کے لیے آٹھ گھنٹے کا دن، کارخانوں کے انتظام میں مزدوروں کی شمولیت وغیرہ وغیرہ۔ ہڑتالوں کی حمایت اور اس سوشلسٹ پروگرام کے اعلان کے نتیجے میں شروع شروع اس دستے میں بہت سے انقلابی مزدور شامل

ہو گئے۔ جب اس بھرتی سے انقلابی محاذ میں پھوٹ پڑ گئی تو مسولینی نے اپنا رُخ بدلا اور سابق فوجیوں، جوشیلے نوجوانوں، تندخو بے روزگاروں اور ان حلقوں سے بھرتی شروع کی جو اپنی چھوٹی چھوٹی جائدادوں سے محروم ہو چکے تھے۔ اب فاشسٹ دستے کے اغراض و مقاصد کچھ اور ہو گئے۔ ایک سال پہلے وہ ہڑتالوں کی حمایت کرتے تھے، اب یہ اعلان ہوا کہ ان کا مقصد بالشویزم کو کچلنا ہے۔ کارخانوں اور جاگیرداروں کے بڑے بڑے مالکوں نے مسولینی کی پارٹی کی جی کھول کر مدد کی۔ دو سال (۱۹۲۱ء) تک یہ مسلح دستے دہشت پسندی کے اصولوں پر چلتے ہوئے سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں پر باضابطہ طور پر حملے کرتے رہے۔ آخر ۱۹۲۲ء میں جب عام ہڑتال ہوئی تو مسولینی نے سے تھوڑے ہی عرصے میں کچل ڈالا۔

امریکن مصنف لوئی واسرمین اپنی کتاب ماڈرن پولیٹیکل فلاسفیز میں لکھتا ہے:-

"مسولینی کی پالیسی کی اچانک تبدیلیاں یہ بتاتی ہیں کہ تحریک صرف ہوا کے رُخ پر چل رہی تھی۔ ۱۹۱۹ء تک مسولینی نے انقلابی سوشلزم کا پرچار کیا، ایک سال بعد تک کارخانوں پر مزدوروں کے زبردستی قبضے کی حمایت کی، اس کے بعد سوشلسٹ دشمن کا بھیس بدلا اور پارلیمانی انتخاب میں رجعت پسندی کا کھلے بندوں ساتھ دیا۔ بڑے بڑے جاگیردار اور مل مالک جو عوامی انقلاب سے سہمے ہوئے تھے فوراً مسولینی کے ساتھ ہو گئے، اور اس کی پارٹی کی سرپرستی کرنے لگے۔ ۱۹۲۲ء میں مسولینی کی پارٹی غنڈوں کے جتھوں سے اس حد تک مسلح ہو چکی تھی کہ اُسے عام ہڑتال کچلنے میں کچھ بھی وقت نہ لگا۔"

دو سال بعد (۱۹۲۲ء) مسولینی نے روم پر دھاوا بولنے کا اعلان کیا۔ شاہ اٹلی کو مسولینی کے سرپرستوں نے جو شاہ کے بھی حامی تھے یہ مشورہ دیا کہ لڑنا جھگڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ شکست خوردہ سوشلسٹ کمیونسٹ کوآپریٹو اور سیاسی ٹمک لیڈروں کی ایک نہ سنی گئی، وہ لاکھ کہتے رہے کہ مارشل لا نافذ کیا جائے اور ٹکر لی جائے۔ مگر شاہ اٹلی نے بلا مقاومت ہتھیار ڈال دیے، اور مسولینی نے وزیر اعظم بننے کے بعد کچھ عرصے تک ایک مخلوط کابینہ سے حکومت کی جس میں لبرل، رائلسٹ اور کلیسائی نمائندے شامل تھے، لیکن جلد ہی اس نے تمام عناصر کو کچل ڈالا، اور ۱۹۲۶ء میں وہ پوری طرح ڈکٹیٹر بن بیٹھا۔

جرمنی میں یہ سیاسی بے چینی اور معاشی الجھنیں اٹلی سے بھی زیادہ تھیں۔ اٹلی تو بہرحال فتح مندوں میں تھا، اُسے صرف یہ شکایت تھی کہ اتحادیوں کی فتح میں اس کا بھلا نہ ہوا۔ لیکن جرمنی کی فوجیں میدانِ جنگ میں ہار چکی تھیں۔ اس لیے وہاں کے عوام کی ناراضگی غم و غصّہ کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ قیصر نے کچھ دستوری اصلاحات دیے، اور حالات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن مقامی بغاوتوں اور عام ہڑتالوں کا سلسلہ جاری رہا۔ سوشلسٹ پارٹی کا زور بڑھتا گیا، یہاں تک کہ مزدوروں اور سپاہیوں کی کونسلیں بڑے بڑے کارخانوں پر چھاپے مارنے لگیں۔ اور روسی پنچایتوں کی طرح یہ کوشش کرنے لگیں کہ سارا اقتدار اُن کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس منزل میں پہنچ کر جرمن سوشلسٹ پارٹی دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ایک انتہا پسند جو روس کی بالشویک پارٹی کی طرح تمام صنعتوں کو ریاست کی ملکیت قرار دینا چاہتے تھے، اور سارے ملک میں محنت کش طبقے کی آمریت قائم

کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے سوشل ڈیماکریٹس جو الکشن اور پارلیمانی ذرائع سے تدریجی معاشی اصلاح کے حامی تھے۔ ان دونوں میں خوب چلی۔ آخر انقلابی بازو کچل دیا گیا۔ انتہا پسند تحریک کے بڑے بڑے لیڈر مار ڈالے گئے۔ اور سوشل ڈیماکریٹ حاوی ہو گئے۔ اب جنوری ۱۹۱۹ء میں دستور سازی کے لیے ایک اجتماع کیا گیا جس نے ویمار دستور تیار کیا۔ یہ دستور امریکہ کے نمونے پر بنایا گیا تھا۔ مگر سوشلسٹ روپ کو قائم رکھنے اور انقلابی عناصر کو مطمئن کرنے کے لیے تدریجی اصلاح کا آخری مقصد یہ قرار دیا گیا تھا کہ تمام صنعتیں رفتہ رفتہ ریاست کے اقتدار و انتظام میں آجائیں گی۔

سوشل ڈیماکریٹس نے اپنے ویمار دستور کے ماتحت جرمنی کی حالت سدھارنے کی بھی بہت کوشش کی۔ اور کسی حد تک وہ اس کو سدھار بھی لائے۔ مگر آخر ناکام رہے۔ اس لیے کہ جب ویمار ری پبلک نے اصلاحی قانون بنانے شروع کیے تو وہی عناصر یعنی شاہی پرست مذہب پرست اور مِل مالک جو انقلابی سوشلسٹوں کو کچلنے میں سوشل ڈیماکریٹس کا ساتھ دے چکے تھے اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے لگے اور ترقی کی مشین کو جام کرنے کے لیے پہیے پکڑ کر بیٹھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں ویمار ری پبلک یوں بدنام ہونے لگی کہ وہ اپنی ترقی پسندی کو روپ نہیں دے پاتی تھی اور خواص یعنی بالائی طبقوں میں یوں نظروں سے گر گئی کہ وہ سوشلزم کی طرف جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نہ یہ طبقہ سوشل ڈیماکریٹس سے خوش رہا نہ وہ طبقہ۔ ویمار ری پبلک گھڑی کے لنگر کی طرح کبھی اس طرف ہو جاتی تھی کبھی اس طرف۔ ان جھکولوں نے مایوسی، بے چینی اور برہمی کے جذبات پھر ابھار دیے۔ کمیونسٹ ابھرے،

انھوں نے اصلاح پسندی کی ناکامی کا تجزیہ کیا۔ سرمایہ داروں کے ہتھکنڈے عوام کو سمجھائے اور محنت کش طبقوں کو انقلاب کے نام پر منظم کرنا شروع کیا۔ اس کے مقابلے میں کرپ اور تھائی سین کے بڑے بڑے مل مالکوں نے ہٹلر کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کی حمایت شروع کی۔ جو حکومت کی بھی مخالفت کرتی تھی، اور عوامی انقلاب کی بھی مخالفت کرتی تھی۔ مسولینی کی طرح ہٹلر نے کوئی اثباتی پروگرام عوام کے سامنے پیش نہیں کیا، بلکہ اپنی ساری تحریک اور ساری تبلیغ منفیانہ نوعیت سے چلائی۔ مثلاً ہٹلر نے کہا کہ ان تمام مصیبتوں کی جڑ وارسلیس کا معاہدہ ہے اور اس کا واحد علاج طاقت ہو، وہ طاقت جو ری پبلک اور اس کے تمام جمہوری اداروں کو توڑ سکے۔ جو یہودیوں کو مٹا سکے، جو معاہدۂ وارسلیس کی دھجیاں اڑا سکے، اور جرمن کی شکست کو فتح میں بدل سکے۔ سرمایہ داروں کو اس پالیسی میں اپنی نجات ہی نظر نہ آئی بلکہ نفع بھی دکھائی دیا۔

امریکن مصنف لوئی واسرمین اپنی تصنیف "ماڈرن پولیٹیکل فلاسفیز" میں لکھتا ہے کہ

"صنعتی اور مالدار طبقوں نے جس میں کرپ اور تھائی سین خاص طور پر قابل ذکر ہیں نیشنل سوشلزم کی بڑی فیاضی سے حمایت کی۔ انھیں اس تحریک سے صرف یہی امید نہیں تھی کہ یہ کمیونزم کو کچل ڈالے گی بلکہ یہ بھی امید تھی کہ عام اسلحہ بندی اور جنگ پسندی کے نتیجے میں ان کو بڑے منافع ہوں گے۔ وہ اس کے نام یا چند سوشلسٹ قسم کے وعدوں سے ذرا بھی خائف نہیں ہوئے۔"

ظاہر ہے کہ جو سوشلزم مذہبی تعصبات کو بھڑکائے اور سائنٹفک منصوبہ بندی کے بجائے جو سوشلزم کی جان ہے اسلحہ بندی اور جنگ پسندی کی تبلیغ کرے اس سوشلزم سے سرمایہ داروں کو ڈرنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ سفید پوش مزدور، تجری حیثیت کے کسان، جوشیلے نوجوان، سابق سپاہی سب نیشنل سوشلزم کی طرف کھنچنا شروع ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں الیکشن ہوا تو نازی اسٹارم ٹروپرس کی دہشت پسندی نے نیشنل سوشلسٹ پارٹی کو سب سے زیادہ جتا دیا۔ شاہ اٹلی کی طرح پریسیڈنٹ ہنڈن برگ نے ہٹلر کو بلایا اور چانسلر کا عہدہ عطا کیا۔

ہٹلر کی یہ جیت صرف دہشت پسندی اور سرمایہ داروں کی شاطرانہ حمایت کا نتیجہ تھی۔ اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ اس سال مارچ سنہ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے خاص طور پر الیکشن کرایا تو اس میں بھی نازی پارٹی کو صرف ۴۴ فی صدی ووٹ ملے، اور نیشنل سوشلسٹ پارٹی نے اپنے تمام جور و ستم کے باوجود خالص نازی کابینہ نہ بنا سکی، جس کے لیے یہ دوسرا الیکشن ہوا تھا۔ بلکہ اسے نیشنلسٹ پارٹی سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ اور مخلوط کابینہ بنانا پڑی۔ اگست سنہ ۱۹۳۴ء میں ہنڈن برگ کی موت کے بعد پریسیڈنٹ کا عہدہ بھی چانسلر کے عہدے میں ملا دیا گیا۔ دوسری پارٹیاں اور مزدور انجمنیں اس سے پہلے ہی توڑ دی گئی تھیں اور خلاف قانون قرار دی گئی تھیں۔ اب ہٹلر پوری طرح ڈکٹیٹر بن گیا۔

جاپان میں: جاپان ان لبرل اور جمہوری خیالات سے جن سے اٹلی اور جرمنی میں فاشزم کو مقابلہ کرنا پڑا واقف ہی نہ تھا۔ وہ اپنے مذہبی تقدس کو بڑی احتیاط سے سمیٹے ہوئے صدیوں سے الگ تھلگ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی قومی اور معاشی زندگی

اس وقت بھی ابتدائی دور میں تھی۔ جب یورپ میں اس کے خلاف آزادی کی جنگ
لڑی اور جیتی جا چکی تھی جس جاپان نے اس نشاطِ ثانیہ اور روشن خیالی کا نام بھی
نہیں سنا تھا جس نے مغربی قوموں کی ساری زندگی بدل دی تھی۔ یورپ اس نے
جاگیرداری نظام کی جگہ نئے نئے جمہوری ادارے قائم کر دیے تھے۔ وہاں اس
ذہنی انقلاب کی خبر پہنچی بھی تھی تو صرف ڈچ جہازرانوں کی زبانی جن کا اڈہ
ناگاساکی تھا اور جو وہاں تجارت کے سلسلے میں جایا کرتے تھے۔ یا تھوڑی بہت
ان گنے چنے جاپانیوں کو چین کے ان ترجموں سے لگ گئی تھی جو چھپ چھپا کر جاپان پہنچ
گئے تھے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے جاپان کو صنعتی انقلاب سائنس کے فروغ
اور انسانیت پرستی کے ان خیالات کا ذرا بھی علم نہ تھا جو یورپ کے سماج میں انقلاب
لا چکے تھے۔ لیکن جب انیسویں صدی کے وسط میں جاپان اس خوابِ غفلت سے چونکا
اور آنکھیں ملتا ہوا جدید دنیا میں داخل ہوا تو اس نے اس تیزی سے صنعتی ترقی کی کہ
صرف پچاس سال میں وہ سب کے برابر آ گیا۔ ایچ جی ویلز لکھتا ہے:

"دنیا کی تاریخ میں کبھی کسی قوم نے اس تیزی سے ترقی نہیں کی
جس تیزی سے جاپان نے کی ہے۔"

یہاں دو سوالات فطری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ ایک یہ کہ آخر وہ کیا حالات
تھے جن کی بنا پر جاپان نے اس برق رفتاری کے ساتھ صنعتی ترقی کی۔ دوسرے یہ
کہ یہ ترقی فسطائی اصولوں پر ہی کیوں ہوئی۔ ان دونوں کے جواب جاپان کے انوکھے
سماج میں ملتے ہیں جو ہمیشہ سے ایک نیم فوجی جاگیردارانہ نظام رہا ہے۔ جاپانیوں
کا عقیدہ رہا ہے کہ ان کی تاریخ پچیس چھبیس صدی پہلے سے شروع ہوئی جب سورج

دیوتا نے اپنے خاص فرزندوں کو اس مخصوص خلقت پر حکمرانی کے لیے جو دنیا کی
ساری قوموں سے افضل ہے جاپان کے جزائر میں اُتارا تھا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جاپانی
قوم منگولین اور ملائی قوم سے مل جل کر بنی ہے جو مشرقی ایشیا سے سمندر کی چھوٹی
سی پٹی کو پار کر کے جاپانی جزائر کے جنوبی حصے میں پہنچے تھے۔ ان مہاجرین نے جاپان
کے پرانے باشندے اینو کو فتح کیا۔ اور رفتہ رفتہ سارے جاپان میں ایک فوجی قسم کا
جاگیردارانہ نظام قائم کر دیا۔ بہرحال جاپان کا سماج قدیم ترین زمانے سے پانچ طبقوں
میں بٹا ہوا ہے۔ ایک ڈائی میوز جو بڑے بڑے جاگیردار تھے، دوسرے سموراس
جو جنگی امرا تھے اور جاگیرداروں کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ساری نیچ آبادی پر
حکمرانی کرتے تھے۔ بقیہ تین طبقے اپنی اونچ نیچ کے لحاظ سے کسانوں، دستکاروں
اور تاجروں پر مشتمل تھے۔ اس سماج کا سب سے چھوٹا واحد گھرانا تھا جس کے بزرگ
کو اپنے گھر والوں پر اسی طرح آمرانہ اور مالکانہ حقوق حاصل تھے جس طرح ایک
ڈائی میوز کو اپنی جاگیر پر۔ ان جاگیرداروں میں ہمیشہ قبائلی جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔
یہاں تک کہ ۱۱۹۲ء میں منا موتو قبیلے نے ایک ایک کر کے سب کو زیر کر لیا۔ اور
شوگن اوّل کے لقب کے ساتھ سارے ملک پر اپنا اقتدار قائم کر دیا۔ یہ فوجی
جاگیرداری ۱۸۶۸ء تک قائم رہی۔ ان سات صدیوں میں سورج دیوتا کے فرزند
تقریباً سات ہی بار "یا تخت پر بٹھائے گئے" "یا طاق پر رکھ دیے گئے"۔ مگر ان کے
تقدس کو کسی وقت بھی ٹھیس نہ لگنے پائی۔ ۱۸۶۸ء میں خانہ جنگی سے تھک کر
مختلف قبائل کے سرداروں نے اپنی بڑی بڑی جاگیروں اور خود مختار عملداریوں
کو ایک دوسرے میں سمو دیا اور سارے ملک میں ایک حکومت قائم کر دی۔

جس میں ہر سردار نے اپنی لیاقت یا طاقت کے لحاظ سے حکومت کے مناسب حصے تقسیم کر لیے۔ اب پھر شہنشاہ جموں تقدس اور اقتدار کا مرکز بن گئے۔

اس نظام حکومت میں جاپان نے صنعت کی طرف قدم بڑھایا تو وہ آندھی کی طرح بڑھتا گیا۔ دوسرے ملکوں میں صنعت کی طرف اس نئے طبقے نے توجہ کی تھی جو جاگیرداروں کی ضروریات تیار کرتے کرتے ایک مال دار طبقہ بن گیا تھا۔ اس لئے وہاں جاگیرداروں اور صنعت میں تصادم ہوا۔ لیکن جاپان میں صنعت کی طرف بھی اسی طبقے نے رخ کیا جو ہر شعبۂ حیات پر حاوی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی مسافت تو ضرور طے کر لی لیکن عوام کی ذہنیت اور مزاج میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ وہ بدستور محکوم و مجبور اور جاہل و ناواقف رہے۔ صنعت کی وہ لہر جس نے مغرب میں نیچے سے اٹھ کر ایک تلاطم برپا کر دیا تھا جاپان میں اوپر ہی سے اٹھی اور اوپر ہی سے گزر گئی۔ سماجی نظام بدستور جاگیردارانہ رہا۔ جو اقتدار و اختیار پہلے صرف جاگیرداروں اور جنگی امرا کو حاصل تھا وہ اب مٹھی بھر سرمایہ داروں ایک مرکزی عاملہ اور ایک جابر فوج میں بٹ گیا۔

تعلیم جو تاریک دماغوں میں اجالا کرتی اور مردہ دلوں میں جان ڈال سکتی ہے بدستور ممنوع رہی۔ اس ممانعت سے پرانی روایات کو بھی تقویت پہنچتی تھی، اور نئی سرمایہ داری کا مقصد بھی پورا ہوتا تھا اس لیے پرانے عقائد کو نئے معنی پہنائے گئے اور عوام کو عمداً ایک اندھے کنویں میں رکھا گیا۔ وہ عقائد جن کی بنیاد پر جاپان کا سارا سماجی نظام قائم تھا مجملاً تین تھے۔ (۱) شنتو (۲) کوڈو (۳) بوشیڈو۔ شنتو جاپان کا قدیم ترین مذہبی عقیدہ تھا۔ یہ ابتداءً صرف گھرانے کے مقدس

بزرگ خاندان کی اطاعت اور مظاہر قدرت کی پرستش پر مشتمل تھا۔ ۱۸۶۸ء میں شہنشاہیت کے دوبارہ قیام کے بعد نئے گھرانے کا تقدس قوم کے تقدس اور بزرگ خاندان کی اطاعت حکمرانوں کی غلامی میں تبدیل ہو گئی۔ حکومت نے جاپانی جزیروں کو دنیا کی مقدس ترین زمین، جاپانی قوم کو مقدس ترین قوم اور جاپانی شہنشاہ کو مقدس ترین ہستی کی تعلیم دینے میں اپنی ساری لیاقت صرف کر دی۔ پرانی روایات کی یہ نئی تفسیریں جاپانی عوام کے دلوں میں آسانی سے اتر گئیں۔ وہ یقین کرنے لگے کہ ساری دنیا ان سے حقیر ہے، اور وہ صرف اس لیے تخلیق ہوئے ہیں کہ وہ دوسری قوموں کو تسخیر کریں اور انھیں یہ پیغام حق سنائیں جس کے صرف وہ حامل ہیں۔ مختصر یہ کہ جب مغربی دنیا میں عالمیت کی تبلیغ ہو رہی تھی اور بین الاقوامیت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی اس وقت جاپان ایک جارحانہ قومیت کی تعلیم دے رہا تھا۔ جب دوسرے ملکوں میں آزادی کے نعرے لگ رہے تھے اس وقت جاپان میں بے چون و چرا اطاعت کا سبق دیا جا رہا تھا۔ جب دنیا میں پرانے توہمات مٹائے جا رہے تھے اس وقت جاپان کا سارا نظام ان ہی توہمات پر مستحکم کیا جا رہا تھا۔

کوڈو، شنٹوازم کی ایک غیر مذہبی تفسیر ہے۔ اس کے معنی ہیں رضائے الٰہی۔ مقصد ہے تسخیر عالم۔ ہر جاپانی بچے کو یہ سبق دیا گیا کہ شہنشاہ جاپان جمو کی عملداری کو بڑھانا جو خدا کی اس مقدس زمین پر اس کے براہ راست وارث کی حیثیت سے اتارے گئے ہیں اس کا سب سے اہم فرض ہو۔ اس تعلیم نے جاپانی فوج کے ہر جارحانہ اقدام کو نہ صرف جائز بلکہ تقدس کا درجہ عطا کر دیا۔

یوشیدو جاگیردارانہ وقت کا ایک سپاہیانہ کردار ہے جو شجاعت، طاقت کے
وسیع بڑھاتا اور اس کے اصول معین کرتا ہے۔ اس کی رو سے اعلیٰ ترین قربانی خود
اپنے ہاتھ سے اپنی جان دینا ہے۔ اطاعت صرف وہ تعمیل حکم ہے جو بے چون و چرا
کی جائے۔ صداقت صرف اس کے ساتھ روا ہے جو اپنا محسن ہو، دوسروں کے
ساتھ صداقت حماقت ہے۔ دشمنوں کے ساتھ صداقت بزدلی ہے۔ ہراکری جسے دنیا
وطن پرستی کا شاندار کارنامہ سمجھتی رہی ہے در اصل اسی مذہب پرستی کا مظاہرہ
تھا۔ جاپانی عقیدے کے مطابق روح یعنی "ہرا" پیٹ میں رہتی ہے اسے
پھاڑ دینا روح کو آزاد کر دینا ہے۔ یہ ایک سپاہی کی اطاعت کا بہترین ثبوت
ہے۔ جب کوئی سمورائی حریفانہ مقابلے میں ہار جاتا تھا تو وہ اپنی عزت و عظمت
برقرار رکھنے کے لیے ہراکری کر لیتا تھا۔

ان تعلیمات نے جاپان میں ایک بالکل ہی نئے انداز میں فاشزم کی طرح
ڈالی۔ یہاں نہ کسی شکست خوردہ ذہنیت کو ابھارنے کی ضرورت پیش آئی نہ
بڑھتے ہوئے مزدوروں کی روک تھام کی ضرورت پیش آئی۔ نہ اٹلی کی طرح
فسطائی دستے بنانا پڑے، جو پہلے مزدوروں کی حمایت کرتے پھر سرمایہ داروں کا
لشکر بن جاتے۔ نہ جرمنی کی طرح اسٹارم ٹروپس بنانا پڑے جو یہودیوں کی سی
کسی مذہبی اقلیت کو مٹانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے۔ نہ کمیونزم کے مقابلے کو بہانا
بنانا پڑا۔ نہ اوسط طبقے کے جذبات کی ترجمانی کرنا پڑی۔ بلکہ ان تمام ظاہری اسباب
کے بغیر ہی فاشزم شروع ہوئی، اور اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔

جو لوگ فاشزم کو کمیونزم کا رد عمل یا اوسط طبقے کا انقلاب کہتے ہیں وہ یہ

بھول جاتے ہیں کہ ایک ایسے ملک میں بھی فاشزم ترقی کر چکی ہے جہاں کمیونزم تو بڑی
چیز ہے کسی نے سوشلزم کا بھی نام نہیں سنا تھا اور اوسط طبقہ بننے ہی نہیں پایا تھا۔
یہ کہنا کہ فاشزم ملک کو کمیونزم کے خطرے سے بچانے یا اعلیٰ طبقوں کے تصادم کی جگہ
متوسط طبقے کا انقلاب لانے کی کوشش ہے محض بھلاوا دینا ہے۔

صنعتی ملکوں میں جیسے اٹلی اور جرمنی میں فاشزم کسی حد تک انقلاب کے
نام پر ضرور بڑھتی جا رہی ہے لیکن اسلئے نہیں کہ اس کا مقصد کوئی انقلاب لانا تھا
بلکہ اس لیے کہ وہاں انقلاب ہی ایک عام پسند نعرہ تھا۔ غیر صنعتی ملک میں جہاں
محنت اور سرمایہ کا مسئلہ واضح نہیں ہوتا بلکہ ساری فضا مذہبی اور سیاسی مسائل
سے تیرہ و تار رہتی ہے، وہاں فاشزم انھیں مسائل کو اچھالتی ہے جیسے جاپان میں
فاشزم کی ساری تعمیر شنتوازم کے نام پر ہوئی۔ اس لیے یہ سمجھنا سخت غلطی ہوگی
کہ فاشزم اسی طرح ایک معاشی یا انقلابی تحریک ہے جس طرح سوشلزم یا کمیونزم
پس سچ یہ ہے کہ فاشزم کا کوئی طریقۂ کار متعین ہی نہیں ہے۔ جیسا حال ویسی چال۔ جیسا
دیس ویسا بھیس۔

ہندستان میں بھی وہ مذہبی تقدس موجود ہے جس نے جاپان میں فاشزم کو جنم دیا۔ وہ سیاسی
مایوسی موجود ہے جس نے اٹلی میں مسولینی کو پیدا کیا اور وہ بڑے بڑے سرمایہ دار موجود ہیں جنھیں سوشلسٹ
ڈھنگ کی منصوبہ بندی سخت ناگوار ہے مگر کانگریس کی قیادت اور جواہر لال کی شخصیت کے
آگے کچھ بن نہیں پڑ رہی ہے۔ اس لئے ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے اور مذہبی، نسلی برتری
اور قدامت پرستی کے ناموں پر ابھرنے والی فاشزم سے اپنے وطن عزیز کو بچائے رکھنا چاہیے۔

آجکل ۱۹۵۰ء

ہندوستان کا جائزہ

ہندوستان غریبوں کا ملک ہے، مگر غریب نہیں ہے۔ اس کی مٹی زرخیز ہے اور اس کے وسائل لامحدود، مگر اس کے باشندے مفلس جاہل اور ایسے بدحال ہیں کہ اسکی مثال دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں مل سکتی۔ امریکہ کے ماہر معاشیات پروفیسر بوکانن نے ۱۹۳۲ء تک ہندوستان کی معاشی، اور صنعتی حالت کا جائزہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

اس ملک میں صنعت کے تمام بنیادی عناصر موجود تھے پھر بھی یہاں کارخانوں کی مصنوعات باہر ہی سے آتی رہیں۔ چند معمولی صنعتیں قائم بھی کی گئیں تو ان کے کل پرزے ہمیشہ باہر ہی سے آتے رہے۔ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان کو بہت سی آسانیاں حاصل ہیں۔ یہاں کچی روئی اور کچے سن کی بہتات ہے۔ کوئلے اور لوہے کی فراوانی ہے۔ سونے اور چاندی کے ایسے ذخیرے ہیں جو دنیا

میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، اسکی سرحدوں کے اندر ہی بہترین منڈیاں ہیں، جن میں غیر ملکی تاجر اپنی مصنوعات کو بڑے منافع کے ساتھ فروخت کرتے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ہندوستان صنعت میں اتنا پیچھے ہے کہ اسکی صرف دو فیصدی آبادی صنعتی کارخانوں سے روزی کماتی ہے۔"

لندن یونیورسٹی کے پروفیسر اقتصادیات ڈاکٹر ڈیرا انسٹی جن کی رائے ہندوستانی معاشیات پر سند سمجھی جاتی ہے لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کی معاشی نشو ونما کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔"

آخر کیوں؟

اس لئے کہ برطانوی سامراج نے ہندوستان کو لوٹنے ہی کے لئے فتح کیا تھا وہ قدیم فاتحین کی طرح یہاں لاؤ لشکر لے کر نہیں آیا تھا۔ ایک مسکین بنئے کی طرح دوکان کھولنے آیا تھا اور ہندوستان کو ہمیشہ منڈی ہی سمجھتا رہا۔ چنانچہ علمی اور سیاسی لحاظ سے تو اس نے ہندوستان کے ساتھ کوئی خاص دشمنی نہیں کی بلکہ بتدریج رعایت ہی کرتا رہا۔ لیکن صنعتی اور اقتصادی لحاظ سے اس نے ہندوستان کو ذرا بھی پنپنے کا موقع نہ دیا۔ اسی دست برد کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ صنعتی طاقت (برطانیہ) سے دو سو سال تک وابستہ رہنے کے باوجود آج ۱۹۴۲ء میں ہندوستان کے صنعتی اعصاب مفلوج نظر آ رہے ہیں اور اس کی اقتصادی ترقی کے تمام راستے رکے ہوئے ہیں۔

برطانیہ کی یورش سے پہلے ہندوستان کی حالت یہ تھی بلکہ اس کی دولت
سارے عالم میں مشہور تھی اور اسی کی لالچ میں مغربی طاقتوں نے ہندستان
پہونچنے کی انتھک دیوانہ وار کوششیں کیں گو کبھی وہ امریکہ کے ساحل سے
ٹکرائے اور کبھی جزائر غرب الہند میں جا نکلے آخر وہ ہندوستان پہونچ ہی
گئے۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں منحوس ترین اور برطانیہ کی تاریخ میں
عظیم ترین دن تھا۔

لارڈ کرزن ہندوستان پر برطانوی قبضہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

> "اس کارنامہ نے انگلستان کو دنیا کی نظروں میں بہت بلند کر دیا
> ہے، آج برطانیہ قدیم ایشیائی براعظم کے اس تخت پر بیٹھا ہے جس نے
> ہمیشہ مشرق پر حکمرانی کی ہے"

(مشرق بعید کے مسائل۔ لارڈ کرزن صفحہ ۴۱۹)

کچھ دن بعد ہندوستان کا یہی وائسرائے پھر لکھتا ہے:۔

> "ہندوستان ہماری سلطنت کا محور ہے، ہماری مقبوضات
> کا کوئی بھی حصہ نکل جائے تو ہم زندہ رہ سکتے ہیں مگر ہندوستان
> نکل گیا تو ہماری سلطنت کا آفتاب غروب ہو جائے گا"

ان جملوں سے صاف ظاہر ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کی غلامی
کو اپنی فوقیت کے لئے کتنا ضروری سمجھا ہے اور ہندوستانیوں کو اپنی تن پروری
کے لئے کس جذبے سے کچلا ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھنا محض نادانی ہے کہ انگریز ہندوستان سے خوشی خوشی

چلا گیا ہے وہ بلا شبہ نکالا گیا ہے اور اب بھی ہندوستان کو لوٹنے کے
لئے اپنی گھات میں لگا رہے گا۔

ہاں تو ہندوستان کی دولت پرانے زمانے میں قصے کہانیوں کی طرح
مشہور تھی۔ جب ۱۷۵۷ء میں کلائیو مرشد آباد پہونچا تو اس نے لکھا:۔

> "یہ شہر اتنا ہی بڑا اور دولت مند ہے جتنا لندن کا شہر۔ بلکہ مرشد آباد
> میں ایسے دولت مند ہیں جن کے مقابلہ میں لندن کے دولت مند
> بھی نہیں آسکتے"

یہی بنگال، کلائیو اور اس کے لٹیرے جانشینوں کے دوران حکومت
میں ایسا تباہ ہوا کہ آج وہاں کے باشندوں کی مفلسی و ناداری ہندستان
میں ضرب المثل ہو گئی ہے۔

کلائیو نے جس دولت کا ذکر کیا ہے وہ مرشد آباد ہی میں محدود نہ تھی
وینس کے مشہور حکیم منوچی نے جو سترھویں صدی میں اورنگ زیب کا
طبیب خاص تھا ہندوستان کے ایک ایک صوبہ کی دولت کا ذکر کیا
ہے، وہ لکھتا ہے:۔

> "فرانس میں سلطنت مغلیہ کا کوئی حصہ بنگال کے برابر نہیں مشہور
> ہے۔ وہاں سے جو بے اندازہ دولت یورپ پہونچتی رہتی ہے
> وہ اس خطہ کی زرخیزی کا ایک واضح ثبوت ہے۔ ہمارے خیال
> میں وہ مصر سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ ریشم، سوت، شکر اور تیل
> کی پیداوار میں اس کا درجہ مصر سے بھی زیادہ ہے، میوے، اناج

تنزیب، ململ، ریشمی اور زرتار کپڑوں کی وہاں افراط ہے۔"
(تاریخ سلطنت مغلیہ شائع کردہ جان بوائز لندن [illegible])
ایک فرانسیسی سیاح برنی ؁۱۶۶۶ء میں مغل سلطنت کے زوال سے
پہلے چشم دید حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-
"میں نے بنگال کے متعلق جو چشم دید معلومات حاصل کی ہیں وہ
مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہیں کہ بنگال مصر سے زیادہ دولت مند ہے
وہ سوتی اور ریشمی کپڑے، چاول، شکر اور مکھن بہت بڑی تعداد
میں باہر بھیجتا ہے اور اپنے استعمال کے لئے بہت کافی گیہوں، دالیں
ترکاریاں، مرغ، بطخ اور قاز پیدا کرتا ہے۔ بھیڑوں اور بکریوں
کے بھی وہاں بڑے بڑے گلے ہیں، شاہی محل سے سمندر تک
نہروں کا جال بچھا ہوا ہے، آب پاشی اور جہاز رانی کے لئے یہ
نہریں گنگا سے کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔"
(بنگال میں آب پاشی کے قدیم طریقے صفحہ ۱۰۔ ۱۹ کلکتہ یونیورسٹی [illegible])
ہندوستان کی صنعتی حالت بھی انگریزوں سے پہلے ترقی پذیر تھی۔ ہندوستانی
صنعتی کمیشن کے صدر سر ٹامس ہالینڈ جن کی رائے ہندوستان کے معدنی
مسائل پر مستند سمجھی جاتی ہے ؁۱۹۰۸ء میں لکھتے ہیں۔
"ہندوستان کا بنا ہوا دیسی لوہا بہت ہی اچھا ہوتا تھا، یورپ
میں اعلیٰ درجہ کا فولاد بنانے کا جو طریقہ آج رائج ہے وہ ہندوستان
میں بہت پہلے دریافت کیا جا چکا تھا۔ یہاں لوہے اور جستی کی بہت ہی

خوبصورت چیزیں بنائی جاتی تھیں۔ ایک زمانہ میں ہندوستان کو
خام دھات کے صاف کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا اور اس کی
بڑی شہرت تھی۔"
غرض جس زمانہ میں یورپ جو آج نئے صنعتی نظام کا گہوارہ ہے صرف
غیر متمدن قبائل کی ایک بستی تھا، اس وقت ہندوستان اپنے حکمرانوں کی
دولت اور اپنے دست کاروں کی صنعت کے لئے دور دور مشہور تھا، یہاں
ایک عام فارغ البالی تھی زراعت بھی ترقی پر تھی، صنعت بھی شہرت
رکھتی تھی اور مجموعی حیثیت سے حالات اتنے اچھے تھے کہ یورپی سیاح
اس کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے مگر آج دو سو سال کی برطانوی حکومت
کے بعد وہ فارغ البالی اور صنعتی ترقی ایک خواب و خیال معلوم ہوتی
اس وقت جب سارا ہندوستان دانے دانے کو ترس رہا ہے۔ جب اس
کی غیر معمولی اکثریت نیم برہنہ ہے اور ایک وقت بھی پیٹ بھر روٹی نہیں
کھا سکتی تو یہ سوچنا بھی محال ہے کہ ہندوستان کبھی خوش خوراک
اور خوش پوشاک تھا۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم ہمیشہ کے غریب ہیں اور ہمیں قدرت
نے غریب بنایا ہے حالانکہ قدرت نے ہمیں ہر طرح کی دولت عطا کی
مگر انسان کے روپ میں انھوں نے اسے دبوچ لیا ہے اور ہندوستان کی
غیر معمولی اکثریت کو ان سے زبردستی محروم کر دیا ہے۔ ان میں سب سے بڑا
برطانوی سامراج تھا جسے آج ٹھوکر مار کر سمندر میں ڈھکیل دیا گیا ہے۔

لیکن انگریز کو ہندوستان سے نکال دینا اور قومی آزادی حاصل کر لینا بجائے خود
حل نہیں ہے۔ اصل مسئلہ ہندوستان کے چالیس کروڑ انسانوں کا مسئلہ ہے
کی اکثریت فاقہ کشی، برہنگی اور انتہائی افلاس میں اپنے دن کاٹ رہی ہے
ج تک ایک بیرونی حکومت کے بھاری پاٹ کے نیچے دبے ہوئے تھے
اس کے جبر و استبداد نے ایک ایسا نظام قائم کر رکھا تھا جس سے ہولناک
ج پیدا ہوئے ہیں۔ قومی آزادی اس دور کی صرف پہلی منزل ہے آخری
ابھی بہت دور ہے اور اس کا راستہ بھی کٹھن ہے۔ برطانوی سامراج نے معمولی تخریب
ں کی ہے جسے مہینوں اور برسوں میں درست کیا جا سکے۔ اس نے ہماری
زندگی کے ایک ایک پہلو کو بری طرح گھائل کر دیا ہے۔ چنانچہ موجودہ
کے تمام مسائل اور ان کی باہمی کشمکش ہندوستان میں بیک وقت
رہی ہے۔ سیاسی لحاظ سے ہندو مسلمانوں کی منافرت انتہا کو پہونچ
ہے، کانگریس نے اسی خطرناک صورت حال پر قابو پانے کے لئے
م ہند کو قبول کر لیا ہے .... اور مہاتما گاندھی اور جواہر لال
اپیل کی ہے کہ اب اس قضیہ کو ختم سمجھنا چاہیے مگر عام جذبات اب بھی
طرح بھڑکے ہوئے ہیں۔ جو طبقے اپنے ذاتی منافع کے لئے ہندوستان
گے بڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں وہ اس صورت حال سے بہت ناجائز
دہ اٹھا رہے ہیں اور وہ اس قضیہ کو ختم کرنے کے بجائے از سر نو شروع
رہے ہیں۔

سماجی لحاظ سے توہم پرستی، ذات پات کے تعصب اور جہالت نے ایک

مذہب کے لوگوں کو بھی الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے اور ایسی سرحدیں
قائم کر رکھی ہیں جن کو عبور کرنا آسان نہیں ہے۔ انسان انسان کا یہ فرق مجموعی
ترقی کے لئے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

طبقاتی لحاظ سے نفع اندوز اور محنت کش طبقوں کے درمیان بہت ہی
بڑی خلیج حائل ہے۔ ایک طرف مالیاتی سرمایہ داری کا جدید ترین نظام ہے
تو دوسری طرف مزدوروں کا افلاس اور ان کی دل ہلا دینے والی زبوں حالی
ہے۔ اقتصادی لحاظ سے تنگ دستی و پریشانی اس وقت کی عام خصوصیات
ہیں۔ نہ زراعت خود کفیل ہے نہ صنعت خود کفیل ہے۔ کسان بھی پریشان ہے
مزدور بھی پریشان ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ابتدائے تہذیب سے لے کر کمال تہذیب
تک جتنے ارتقائی مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ سب ہندوستان میں اپنی
ڈراؤنی شکلیں اک ساتھ دکھا رہے ہیں۔ کچھ مسائل قدرتاً پیدا ہوئے ہیں
کچھ عمداً پیدا کئے گئے ہیں تاکہ برطانیہ کا سہارا لینے کی ضرورت بار بار پڑتی
رہے۔ مگر ہراساں ہونے کی بات نہیں ہے۔ ہندوستان کے قدرتی وسائل
ان تمام مشکلوں کو حل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اب وہ اپنی تقدیر کا خود
مالک ہے، اپنے مستقبل کا خود معمار ہے اس لئے وہ اسے سنبھالے گا اور دنیا
کی ترقی یافتہ قوموں میں عنقریب ایک باعزت درجہ حاصل کرے گا۔ یہ
تعمیر کتنی مشکل ہے۔ اور ہمارے لیڈروں کو کتنے کٹھن کام اور انجام دینے ہیں
ان کا صحیح اندازہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم موجودہ ہندوستان کے ایک
ایک پہلو کا الگ الگ جائزہ لیں اور اس کے بعد سوچیں کہ برطانیہ نے

ہندوستان کو کس حالت میں چھوڑا ہے آزادی کی ضرورت اور صحیح اہمیت بھی
ہم کو اسی وقت معلوم ہوگی جب ہندوستان کو دنیا کے دوسرے ملکوں کے
مقابل دیکھا جائے اور یہ اندازہ لگایا جائے کہ ہم کتنے پیچھے ہیں اور ہمیں
آگے بڑھنے کے لئے کیا کرنا ہے۔

سب سے پہلے زراعتی حالت پر نظر ڈالئے۔ قدرتی لحاظ سے ہندوستان دنیا
کا سب سے بڑا ملک ہے، اس کی زمین سونا اگلتی ہے، مگر اوسط پیداوار میں
ہندوستان امریکہ سے بھی پیچھے ہے، آسٹریلیا سے بھی پیچھے ہے، روس کا تو ذکر
ہی کیا۔ اوّل یہاں بے حساب زمین بیکار پڑی ہے۔ ثانیاً جس زمین پر کاشت
کی بھی جاتی ہے تو ان پرانے طریقوں سے جو ہندوستان کے علاوہ ہر ملک
میں متروک کئے جا چکے ہیں۔

سرجان واٹ ہندوستان میں معاشی پیداوار پر حکومت کو رپورٹ
دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر آبپاشی کو وسعت دی جائے نقل و حمل میں آسانیاں فراہم
کی جائیں، زراعتی طریقوں اور زراعتی سامان کو ترقی دی جائے اور
کاشت کا علاقہ بڑھایا جائے تو ہندوستان کی پیداوار کم از کم پچاس
فیصدی بڑھ سکتی ہے اس لئے کہ زرعی ترقی کے جو امکانات ہندوستان
کو حاصل ہیں وہ شاید ہی دنیا کے کسی اور ملک کو میسر ہوں۔"

(برطانوی ہند کے وسائل پر یادداشت، ۲۵ کلکتہ ۱۸۹۳ء)

ہندوستان کے صنعتی وسائل اور ان کی طرف سے پچھلی حکومت کی

غفلت اس سے بھی زیادہ قابل توجہ ہیں۔ امریکہ کا ٹیکنیکل مشن جو ۱۹۴۲ء میں
ہندوستان آیا تھا، یہاں کے وسائل اور صنعتی ترقی کے امکانات کا ذکر کرتے
ہوئے لکھتا ہے:۔

"بنگال اور بہار میں کوئلہ کا ذخیرہ اندازاً ساٹھ ارب ٹن ہے
(ایک ٹن = ۲۸ من) اس میں سے ۲۰ ارب ٹن کوئلہ نکالا جا سکتا ہو
سی۔ پی اور برار میں سترہ ارب ٹن ہے۔ اس میں سے پانچ ارب
ٹن نکالا جا سکتا ہے۔ آسام میں کوئلہ کے ذخیرہ کا اندازہ آٹھ کروڑ
ٹن تک کیا جاتا ہے ایسا کوئلہ جو دھات صاف کرنے کے لئے استعمال
ہوتا ہے۔ اس کے ذخیرے اندازاً پچاس کروڑ ٹن ہیں، لیکن کوئلہ
کھودنے کے مروجہ پست طریقوں کی بدولت اس میں سے نصف
کوئلہ ضائع ہو جاتا ہے۔ جو کوئلہ دھات صاف کرنے کی غرض سے
کوک بنانے کے لئے موزوں ہے اس کو اسی مصرف میں لایا جائے
تب بھی لوہے کی صنعت کو کئی گنا بڑھا دینے کے بعد بھی سالہا سال
تک یہ ذخیرے کام میں آتے رہیں گے۔"

(امریکی ٹیکنیکل مشن رپورٹ ۱۹۴۳ء)

کچے لوہے کے بارے میں امریکی ٹیکنیکل مشن کی رائے ہے کہ اس کے
ذخیرے ہندوستان میں کم از کم تین ارب ٹن ہیں جب کہ برطانیہ کے ذخیرے
صرف دو ارب پچیس کروڑ چالیس لاکھ ٹن اور جرمنی کے ذخیرے ایک ارب
پینتیس کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن ہیں۔ المونیم کی کچی دھات بھی ہندوستان میں بڑی

کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ میگنیز کا ۷۰ فیصدی حصہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ ابرق کی تین چوتھائی پیداوار ہندوستان ہی میں ہوتی ہے اور لاکھ تو دنیا میں سب سے زیادہ ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ بجلی کے وسائل ہندوستان میں امریکہ کے بعد سب سے زیادہ ہیں۔ مگر ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ برقابی کی تمام صلاحیت ضائع ہو رہی ہے۔

برقابی وسائل

ملک	مضمر طاقت	ترقی یافتہ طاقت	فیصدی وسائل
امریکہ	۳۵	۱۱٫۷	۳۳
ہندوستان	۲۰	٫۸	۳
جرمنی	۲	۱٫۱	۵۵
سوئزرلینڈ	۲٫۵	۱٫۸	۷۲

یعنی وسائل کے لحاظ سے ہندوستان امریکہ کے بعد سب سے آگے ہے مگر ترقی کے لحاظ سے وہ سوئزرلینڈ سے بھی کوسوں پیچھے ہے اس ننھے سے ملک کی مضمر طاقت صرف ۲٫۵ ہے اور وہ اس سے ۷۲ فیصدی کام لے رہا ہے اس براعظم کی مضمر طاقت ۲۰ ہے مگر یہاں صرف ۳ فیصدی کام لیا جا رہا ہے۔ غرض ہندوستان کے تمام وسائل ضائع کئے جا رہے ہیں۔ برطانوی حکومت نے ان سے عمداً غفلت کی ہے تاکہ ہندوستانیوں کو پیٹ بھر روٹی نہ ملے جو اپنی قدرتی دولت سے ناواقف رہیں اور یہ سمجھیں کہ برطانیہ کے بغیر

ان کی پرورش ناممکن ہے۔ اگر برطانیہ ہندوستان کو منڈی نہ سمجھتا تو اس کا نظریہ مختلف ہوتا۔ مسلمان بھی ہندوستان میں باہر سے آئے تھے مگر انھوں نے اپنی دولت بھی ہندوستان کو بنانے اور سنوارنے میں لگادی، اس ملک کو اپنا وطن بنالیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستانی بن گئے۔ انگریز دو سو سال تک ہندوستان کی روٹیوں پر پلتا رہا مگر اس نے ہندوستان سے دور کی بھی وابستگی نہ پیدا کی۔ چنانچہ آج جب وہ زبردستی ہندوستان سے نکالا جا رہا ہے تو یہاں کی حالت اتنی خستہ ہے کہ دیکھنے کے بھی لائق نہیں ہے۔ جب زراعت وصنعت کی یہ درگت ہو تو ہندوستانیوں کا جو بھی حال نہ ہو جائے کم ہے۔ برطانیہ اس بدحالی کو طرح طرح سے چھپانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ کبھی اس نے یہ تاویل گڑھی ہے کہ یہاں کی آبادی بڑھ گئی ہے۔ کبھی اس نے ہندوستان کی قومی اور فی کس آمدنی کے بارے میں غلط سلط اعداد وشمار پیش کئے ہیں لیکن ہندوستانیوں کے مصائب اس منزل پر پہونچ چکے ہیں جہاں ان کو چھپانا ناممکن ہے۔

خود سائمن کمیشن کی رپورٹ بھی اگر صحیح مان لی جائے جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی اور برطانوی حکومت کے پروپگنڈے سے پڑھ ہے تو ہندوستان کی اوسط آمدنی سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں پانچ آنے روزانہ سے زائد نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اس آمدنی کی بنیاد پر کسی ملک کو خوشحال نہیں کہا جا سکتا۔

جنگ عالم کے دوران میں یہ آمدنی بڑھ ضرور گئی مگر اشیاء کی گرانی اس سے کہیں زیادہ بڑھ گئی اور آج تک اسی سطح پر قائم ہے۔ اسلئے اس

وقت بھی جب روپیہ عام طور سے سستا ہے ہندوستانیوں کی وہی درگت
ہے اور ان کے لئے موت کے علاوہ اب بھی ہر چیز گراں ہے۔

ہندوستان کے ماہرین معاشیات شاہ اور کھمباٹا کا خیال ہے کہ

" ہندوستان کی اوسط آمدنی اتنی کافی ہے کہ ہر تین آدمی
میں صرف دو اپنا پیٹ بھر سکتے ہیں یا تینوں اس وقت پیٹ
پال سکتے ہیں جب وہ صرف دو وقت کھائیں، ان میں سے ہر ایک
ننگا رہے، سال میں ایک دن بھی مکان کی آرزو نہ کرے اور
ایک لمحہ کے لئے بھی آرام کا خیال نہ لائے۔ غذا کے علاوہ کسی
اور چیز کی تمنا نہ کرے۔ اس وقت بھی اسے ایسی غذا ملے گی جو طاقت
بخش نہ ہوگی بلکہ معمولی اور بری ہوگی۔"

(ہندوستان کی دولت اور ٹیکس کی صلاحیت، صفحہ ۳، ۱۹۲۴ء)

ہندوستانی میڈیکل سروس کے ڈائرکٹر میجر جنرل سر جان میگا نے
اپنی صحت عامہ کی رپورٹ ۱۹۳۳ء میں لکھا ہے۔

" یہاں کی ۴۱ فیصدی آبادی کو بری غذا ملتی ہے، اور
۲۰ فیصدی آبادی کو بے حد خراب غذا ملتی ہے۔"

یعنی ہندوستان کی ۶۱ فیصدی آبادی مستقل طور پر فاقہ کشی یا نیم فاقہ کشی
میں مبتلا ہے۔

ماہر غذائیات ڈاکٹر رائڈ کا بیان ہے کہ۔

" ہندوستان میں ایک تہائی آبادی کو ہر زمانہ میں انتہائی

حد تک توہین کن غذا ملتی ہے۔"

رہائش کی یہ مصیبت ہے کہ ایک مزدور گھرانے کو ایک کوٹھری بھی نصیب
نہیں ہوتی، پورے مکان کا تو وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ۱۹۳۷ء میں
بمبئی کی کانگریسی وزارت نے سوتی کارخانوں کی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر
کی تھی اس کا بیان ہے کہ۔

" ۹۱.۲۴ فیصدی مزدور صرف کوٹھریوں کو گھر بنائے ہوئے
ہیں۔"

وہٹلے رپورٹ کا بیان ہے کہ۔

" کراچی کی ایک تہائی آبادی ایسی ہے جسے ایک کمرہ کے
علاوہ کچھ نہیں نصیب ہے اور ان کمروں میں بیک وقت چھ سے
نو آدمی تک رہتے ہیں۔" احمد آباد میں پچھتر فیصدی مزدور صرف
ایک کمرے کے گھروں میں ٹھسے رہتے ہیں۔"

ہندوستانی صنعت کمیشن کا بیان ہے کہ۔

" ہندوستان کے باہر بھی افلاس کے بہت سے مناظر دیکھنے
میں آتے ہیں لیکن مفلسی کی شدت اور بدبختی کسے کہتے ہیں، اس کا
صحیح اندازہ ہندوستان ہی میں ہوتا ہے۔ یہاں کے مزدوروں
کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ انسان نہیں کوئی خیالی مخلوق ہے
جو زمین کے نیچے سے رینگتی ہوئی اوپر آگئی ہے۔"

صفائی کی عام حالت پر وہٹلے رپورٹ کا بیان ہے کہ۔

"ہر طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں، گندے نالوں میں پانی سڑا کرتا ہے، پاخانوں کی کمی اور گندگی کی وجہ سے زمین غلیظ اور فضا متعفن رہتی ہے۔ مکان زیادہ تر بغیر کرسی، بغیر کھڑکی اور بغیر روشن دان کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر صرف ایک دروازہ ہوتا ہے اور وہ بھی اتنا چھوٹا کہ بغیر جھکے اندر داخل ہونا ناممکن ہے۔ اس میں تھوڑی بہت روشنی آتی بھی ہے تو اس میں رہنے والے مختلف جوڑے اپنی پردہ داری کے خیال سے پردہ ڈال دیتے ہیں اور اسے کال کوٹھری بنا دیتے ہیں جس میں ہوا کا گذر ہو نہ روشنی کا گذر۔ ان ہی بلوں میں انسان پیدا ہوتے ہیں، کھاتے ہیں، سوتے ہیں، رہتے ہیں اور مرتے ہیں۔"

جو لوگ صرف نئی دہلی کی صاف ستھری سڑکیں اور عالی شان مکانات دیکھ کر سارے ہندوستان کا اندازہ لگایا کرتے ہیں، انھیں ہندوستان کی یہ اصل حالت سن کر اچنبھا ہوگا، مگر وہ مصنوعی دنیا کا ایک پرفریب نظارہ ہے۔ ہندوستان کا اصلی روپ یہی ہے جو مختلف رپورٹوں کے بیانات کو غور سے دیکھنے اور انھیں جمع کرنے کے بعد ہی نظر آسکتا ہے۔

اس فاقہ کشی اور گندگی کا صحت عامہ پر جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے چنانچہ ۱۹۳۶ء میں موت کا اوسط ہندوستان میں ۲۲ء۴ فی ہزار تھا، اسی زمانہ میں انگلستان میں موت کا اوسط ۱۲ء۴ فی ہزار تھا۔ عمر کا اوسط ہندوستان میں ۲۶ء۷ سال اور انگلستان میں ۵۵ء۹ سال ہے۔

یہ موتیں عام طور پر بخار کا نتیجہ بتائی جاتی ہیں مگر یہ مفلسی اور گندگی کا نتیجہ ہے جسے برطانیہ نے دور کرنے کی عمداً کوشش نہیں کی۔ دکھاوے کے لئے کہیں کہیں بڑے بڑے اسپتال اور صاف ستھرے شہر ضرور کھڑے کر دیئے ہیں، مگر ہندوستان کی فضا کو اسی طرح تیرہ و تار چھوڑ دیا ہے۔

بھور کمیٹی نے، جسے حکومت ہند نے ۱۹۴۳ء میں صحت عامہ کا جائزہ لینے اور ترقی کے مشورے دینے کے لئے مقرر کیا تھا، ۱۹۴۶ء میں لکھا ہے کہ:۔

"یہ بیماریاں اور موتیں زیادہ تر اس لئے واقع ہوتی ہیں کہ ملک کے بیشتر حصہ میں وہاں کے ماحول کے مطابق صفائی کا انتظام نہیں ہے، بری اور کم غذا میسر آنے کی وجہ سے آبادی کے بہت بڑے حصے کی قوت مدافعت کم ہو گئی ہے، موجودہ طبی انتظام آبادی کی ضروریات کے لئے ناکافی ہے۔ تعلیم کی کمی اور اصول صحت سے ناواقفیت کی وجہ سے لوگ اپنے گرد و پیش کی گندگی پر توجہ نہیں کرتے اور بیماریوں کی طرف سے بھی غافل رہتے ہیں۔"

یہ حقائق پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان کی ساری تباہی برطانوی سامراج کی لائی ہوئی ہے۔ ان کا ازالہ اسی وقت ممکن تھا، جب ہندوستان برطانوی سامراج سے چھٹکارا پائے اور اپنی دولت کا آپ مالک بنے چنانچہ کانگریس نے ہندوستان کی اسی بدحالی اور برطانیہ کی اسی تباہکاری کو دیکھتے ہوئے اس وقت یہ کوشش کی کہ جس طرح اور جتنی جلد ممکن ہو برطانیہ کی سامراجی گرفت سے نجات حاصل کی جائے۔ ہندوستان کی مجموعی حالت اتنی سنگین ہو چکی تھی کہ اب اسے برطانیہ کی "نگہداشت" میں ایک دن کے لئے بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا

اس لئے کانگریس نے جماعتی قضیئے پس پشت ڈالدیئے اور جن شرائط پر بھی آزادی مل رہی تھی لے لی۔ اس اقدام پر یک گونہ بے اطمینانی غلط نہیں ہے، چنانچہ ایک طرف کامرانی وشادمانی کا جذبہ ہے تو دوسری طرف یہ احساس بھی چبھ رہا ہے کہ ہندوستان کو وہ آزادی نہیں ملی جس کا وہ متمنی تھا، بہرحال آزادی ایک بیش بہا نعمت ہے اور اس کی فوری تحصیل ہندوستان کے لئے ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس لئے اب تمام اختلافات کو بھلا دینا چاہیئے، اور آزاد ہندوستان کی از سرِ نو تعمیر کرنا چاہیئے، ایسی تعمیر جو افلاس، جہالت توہم اور آپس کی کشمکش کو ہمیشہ کے لئے ختم کردے، اصل مقصد حکومت نہیں بلکہ ہندوستان کو ترقی اور فارغ البالی کے راستہ پر چلانا ہے۔

اطلاعات صوبہ متحدہ
(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء)

ہمارا فنِ موسیقی

ہندوستان کا گانا آدم کے اُس پہلے سُر سے شروع ہوا جو تخلیقِ عالم کے لئے چھیڑا گیا تھا۔ اسکے بعد بساطِ عالم یوں بچھی کہ سطحِ آب پر ایک "کچھو" بن گیا۔ جس کے چاروں کونوں پر بڑے بڑے ہاتھی غیب سے آکر کھڑے ہوگئے، اور مرکز میں اتنا بڑا ناگ پھن کاڑھ کر بیٹھ گیا کہ یہ سارا کرۂ ارض اسکے ایک تل پر ٹکا ہوا ہے۔

سُروں کا تعارف

"اونکار" کی اس کرشمہ سازی کے بعد دیوتاؤں اور اوتاروں کا نزول ہوا اور حمد وثنا کے نغموں سے کائنات گونج اٹھی، یہ اوہامی باتیں کتنی ہی بعید از قیاس ہوں مگر انکا ذکر یہ بتانے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے گانے کی روح کیا اور کتنی مقدس ہے۔

"آدم" کی صدائے ربانی پر سات سُر منتشر ہوگئے۔

کھرج، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت، نکھاد۔

بعد ازاں مہادیو جی نے کہ "برہما" کی بائیں ابرو سے پیدا ہوئے تھے اور

سنو نے ان کو علم صوت کی ترتیب پر مامور کیا تھا۔ بارہ سُر قائم کئے۔

ان مزید پانچ سُروں کو تیور اور کومل بھی کہتے ہیں۔ یعنی چڑھا سُر اور اُترا سُر۔ نغمۂ فارسی کے واقف کاروں کا خیال ہے کہ یہ محض تیور اور کومل نہیں ہیں بلکہ حکمائے یونان کی طرح حکمائے ہند نے بھی بارہ سُر قائم کئے تھے، جن میں سے پہلے سپتک یعنی پہلے سات سُر کے نام تو علیحدہ علیحدہ آج تک موجود ہیں مگر مزید پانچ سُروں کے علیحدہ نام گم ہوگئے اور وہ صرف تیور اور کومل کی حیثیت سے باقی رہ گئے۔ بہرحال بارہ سُر نغمۂ ہندی میں بھی ہیں اور بارہ نغمۂ فارسی میں بھی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے نغمہائے فارسی کے واقف کاروں کو نغمہائے ہندی کی جانکاری میں آسانی ہوئی اور وہ دونوں کو ملا کر نئے نئے راگ اور نئے نئے ساز بنانے میں کامیاب ہوئے۔

مہادیوجی کی پہلی "سپتک" کے تین درجے کئے گئے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ایک سپتک کے انتہائی سُر سے دوسری سپتک شروع ہوتی ہے اور دوسری سپتک کے انتہائی سُر سے تیسری سپتک شروع ہوتی ہے۔ اس طرح تیسری سپتک کے انتہائی سُر سے چوتھی سپتک شروع ہونا چاہیئے مگر کہتے ہیں کہ انسان کی آواز اتنی اونچی جاتی ہی نہیں کہ چوتھی سپتک شروع ہو۔ غرض تیور اور کومل دیئے ہوا سُر اور اُترا سُر کو چھوڑ کر ۲۱ سُر ہوئے یعنی تین سپتکیں۔ یہ اکیس سُر مہادیوجی یا دوسرے اوتاروں نے قائم کئے ہیں۔ انسان کا کارنامہ اسکے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

راگوں کا تعارف — سُر کی طرح مہادیوجی نے راگ بھی بنیادی

طور پر مقرر کر دیئے ہیں۔

بھیروں، دیپک، میگھ، سری، ہنڈول، مالکوس

سات سُروں سے ۶ راگ یوں بنے کہ ان میں سے اوّل سُر یعنی کھرج سنگِ بنیاد رہا۔ جو راگ بھی شروع ہوگا۔ کھرج سے شروع ہوگا۔ یہ ہر راگ کا منبع ہے۔ چنانچہ ذات وصفات کے لحاظ سے کھرج بادشاہ سُراں ہے۔

بھیروں ولیعہد ہے۔ دیپک وزیر ہے۔ میگھ کوتوال ہے۔ سری داروغۂ عدالت ہے۔ دھیوت مالک فوج ہے، اور مالکوس دختر وزیر ہے۔

بھیروں کی تشبیہ یہ بتائی گئی ہے۔ گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، اونچی ناک، چوڑی پیشانی، گول منہ، مونچھیں چڑھی ہوئی۔ بالوں کا جوڑا سر پر، ایک سانپ جوڑے سے لٹکتا ہوا، دوسرا کمر میں لپٹا ہوا، زنار گلے میں، سرخ ریشمی دھوتی، آنکھوں میں، ہیرے کی انگوٹھی انگلی میں۔ موتیوں کا ہار ہاتھ میں، سن بارہ ہزار دو سو برس۔ یہ پہلا راگ بھیروں کا سراپا ہوا جو رکھب سے نکلا ہے۔

اسی طرح ہر راگ کی شکل وصورت اور سن وسال مقرر ہیں۔ جن کا بیان طوالت کے خیال سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ البتہ مصنف سب راگوں کی ایک ہی بتائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ سب راگ مرد اور عورتیں ہیں۔

بھیروں کی تاثیر یہ بتائی گئی ہے کہ جب استادانِ قدیم اس راگ کو گاتے تھے تو کولہو از خود چلنے لگتا تھا۔

دیپک کے بارے میں سب ہی نے سُنا ہے کہ چراغ از خود روشن ہو جاتے ہیں۔ میگھ کے بارے میں بھی عام طور پر مشہور ہے کہ پانی برسنے لگتا ہے۔

سری راگ سے طیور و وحوش تک اپنے ہوش کھو بیٹھتے ہیں، انسان کا کیا ذکر۔
ہنڈول سے جھولا از خود ڈولنے لگتا ہے۔
مالکوس سے بہتا ہوا پانی رک جاتا ہے۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس شخص نے بھی دیپک راگ شروع کیا چراغ خود جلنے لگے یا میگھ راگ شروع کیا تو پانی از خود برسنے لگا۔ بلکہ یہ ہیں کہ جس شخص نے جس راگ کا عمل کیا اس کے اس راگ کے گانے سے یہ تاثیریں ظاہر ہوتی تھیں۔ مثلاً عہد اکبری کے بارے میں لکھا ہے کہ تان سین کے میگھ گانے سے پانی برستا تھا۔ بیجو باورا کے دیپک گانے سے چراغ جل اٹھتے تھے۔ [illegible] کے سری راگ گانے سے طیور و وحوش وجد میں آجاتے تھے۔ اسی طرح بیجو چند، سری چند وغیرہ کے گانے میں بھی تاثیریں تھیں، گویا گانا ایک عمل تھا، گانے والا ایک عامل اور راگ اس کا موکل۔ ہر راگ کے ساتھ پانچ پانچ راگنیاں مقرر ہیں۔ مثلاً پرتھم راگ (اول راگ) بھیروں سے بھیرویں۔ براری۔ مدھمادت۔ سندھوری۔ بنگالی نام کی راگنیاں نکلی ہیں۔ ان راگنیوں کی ذات و صفات بھی متعین ہیں۔

مثلاً بھیرویں کی شبیہ یہ بتائی گئی ہے:۔
چمپئی رنگ، چوڑی پیشانی، پیوستہ ابرو، غزالی آنکھیں، متوسط ناک، [illegible] گردن، پتلی کمر، سن عین شباب، پوشاک سوسنی۔

مالکوس کی راگنیاں یہ ہیں:۔
ٹوڈی، گوری، گن کلی، کھنباوتی، کوکب۔

ان میں سے کوکب کی شبیہ یہ بتائی گئی ہے:۔
حسین بدن، کشادہ ابرو، آہو چشم، بلند بینی، اوسط اندام، [illegible] چہرہ، نہایت خوبصورت، سن عین شباب، مست و الست، سو رہی ہے۔

ہنڈول کی راگنیاں یہ ہیں:۔
رام کلی، دیساکھی، دیوگری، باسنتی، ٹنکی (؟)۔

دیپک کی راگنیاں یہ ہیں:۔
کامودی، پٹ منجری، سارنگی، کندھاری، گوند گری (؟)۔

سری راگ کی راگنیاں یہ ہیں:۔
بیرائی (؟)، کرناٹی، مالسری، ساویری، دھناسری۔

میگھ کی راگنیاں یہ ہیں:۔
ملاری، سورٹھ، سوہنی، اساوری، لنگن (؟)۔

ہر راگنی کا سراپا متعین ہے اور گانے کے اوقات بھی مقرر ہیں۔
مثلاً بھیروں اور اس سے مشتق راگنیاں، کنوار و کاتک کے مہینوں میں صبح سے ڈیڑھ پہر دن چڑھے تک گائی جاتی تھیں۔
مالکوس، اگہن و پوس کے مہینوں میں ڈیڑھ پہر دن رہے تک۔
ہنڈول، پھاگن و چیت میں ڈیڑھ پہر دن رہے سے شام تک۔
دیپک، جیٹھ و بیساکھ میں شام سے ڈیڑھ پہر رات گئے تک۔
سری، جیٹھ، اساڑھ میں ڈیڑھ پہر رات گئے سے ڈیڑھ پہر رات رہے تک۔
میگھ، ساون و بھادوں میں ایک پہر رات رہے سے صبح تک گایا جاتا تھا۔

ایجادات و اختراعات

اس سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے گانے کی کل پونجی چھ راگ اور تیس راگنیاں ہیں۔

دراصل یہ بھی یقینی نہیں ہے کہ ہر راگ سے پانچ ہی راگنیاں وابستہ ہیں۔ بعضے کہتے ہیں کہ چھ چھ راگنیاں نکلی ہیں۔ اس طرح چھتیس راگنیاں ہوئیں۔ غرض تیس ہوں یا چھتیس ہر راگنی سے آٹھ آٹھ پتر (لڑکے) ہوتے ہیں۔ اس کے بعد راگنیوں کی قسمیں الگ ہیں، پتروں کی قسمیں الگ ہیں اور پتروں کی بھارجاؤں (زوجاؤں) کی قسمیں الگ ہیں، پھر ایک دوسرے کے میل سے جو ایجادات و اختراعات ہوتی رہی ہیں ان کی قسمیں الگ ہیں۔ غرض ایک سلسلہ لامتناہی ہے کہ چلا جاتا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ اسلئے کہ انسان کے فکر و خیال کی نہ حد ہے نہ حساب ہو۔ تخلیق و آفرینش کا کام تو ایک جگہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر تزئین و آرائش کا کام ایک جہد مسلسل ہے جو نہ ختم ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اختراعات بیان کئے جاتے ہیں۔

بھیروں کی راگنی بھیرویں ہے۔ بھیرویاں سات بنائی گئی ہیں۔

اوّل بھیرویں خاص یعنی بھیرویں اپنے اصلی روپ میں۔ دوم بھیرویں بلاس خانی یعنی وہ بھیرویں جس میں بلاس خاں نے کافی کا دیا میل کیا کہ بھیرویں کی ایک نئی شکل بن گئی۔ اسی طرح میران مردھ ناگ نے بھیرویں بہاری ایجاد کی۔ سلطان شرقی نے بھیرویں سندھ ایجاد کی وغیرہ وغیرہ۔

پانچویں کی راگنی ٹوڑی ہے۔ اس سے چودہ ٹوڑیاں بنائی گئیں۔

اوّل ٹوڑی خاص، دوم ٹوڑی نیشاپوری جسے امیر خسرو نے ایجاد کیا۔

سوم ٹوڑی جونپوری جسے سلطان شرقی نے ایجاد کیا۔ اسی طرح ٹوڑی فیروز خانی۔ ٹوڑی بلاس خانی۔ اور میاں کی ٹوڑی جسے تان سین نے ایجاد کیا وغیرہ وغیرہ۔

دیپک کی ایک راگنی سارنگ ہے۔ اس سے آٹھ سارنگ بنے ہیں۔

اوّل سارنگ خاص۔ دوم سارنگ مدھمات جسے میران مردھ ناگ نے دیگر راگنیوں، سورٹھ اور مدھمات کی سنگت سے ایجاد کیا۔ سوم سارنگ بندرابنی جو متھرا کی طرز ہے اور جس کا موجد کوئی ایک شخص نہیں بتایا جاتا۔ چہارم میاں کی سارنگ جسے تان سین نے ایجاد کیا۔ اسی طرح بیجا پوری، گوپال لال اور دوسرے گاؤں والوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مختلف سارنگ بنائے ہیں لیکن ع

ناد پابندِ نَے نہیں ہے

ان ایجادات و اختراعات کے دوش بدوش کہ جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صاحب کمال سے موسوم ہے اور جن کا سلسلہ امیر خسرو سے درویش سے لے کر واجد علی شاہ سے بادشاہ تک ملایا جا سکتا ہے وہ ایجادیں بھی ہوتی رہی ہیں جن کے ایجاد کرنے والے تو کبھی معلوم ہی نہ ہوئے مگر ایجادیں آج تک قائم ہیں۔ جیسے سارنگ بندرابنی کہ کسی ایک کے نام پر نہیں، سارے ملک کے نام پر موسوم ہے۔ وجہ ظاہر ہے، وہ یہ کہ جیسے کلام موزوں از خود نکلا اور موزوں کرنے کے قاعدے ضوابط یعنی عروض و قوافی بعد کو ترتیب پائے۔ اسی طرح راگ بھی از خود نکلا اور راگ مالائیں بعد کو

بنائی گئیں۔ چنانچہ جیسے شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو عروض و قوافی کو سامنے رکھ کر اپنا کلام موزوں کرتے ہیں، دوسرے وہ جن کا کلام موزوں خود ہی عروض و قوافی پر پورا اترتا ہے۔ اسی طرح گانے والے بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سر، گا، ما، سیکھ کر اپنے گلے میں سُر پیدا کرتے ہیں، دوسرے وہ جن کے گلے میں خود ہی سُر بسے ہوتے ہیں۔ جن کے گلے میں خود ہی سُر بسے ہیں، وہ جب بھی اور جو کچھ بھی گائیں گے وہ کسی نہ کسی راگ کے مطابق ہوگا۔ ایسے ہی طبع زاد گانے والوں نے، جن کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ نمایاں ذی لوگوں میں سے ہوں۔ مثلاً برہمن، راجپوت، راجہ، نواب، بادشاہ اور درویش اور غیر نمایاں لوگوں میں سے نہ ہوں۔ مثلاً پھار، پاسی، گوڑریئے، کمہار اور دھار وغیرہ جو پرانے زمانہ میں رذیل کہلاتے تھے، وہ ایجادیں کی ہیں۔ جو شخصی نام کے علاقائی نام سے مشہور ہیں۔ جیسے پہاڑی، بہار، ملتانی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب دھنیں مختلف راگنیوں کے حسین امتزاج سے بنی ہیں۔ اور ان میں سے بعض میں ایسا لطیف و نازک ردوبدل کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے استاد بھی اس فرق کے امتیاز میں چوک جاتے ہیں۔ مثلاً ملتانی کو بھیم پلاسی سے امتیاز کرنا بڑا مشکل ہے۔ ان طبع زاد گانے والوں نے، جن کو پرانی کتابوں میں عطائے صحرائی کہا گیا ہے، اپنے گانے کے بول بھی اپنے ہی گرد و پیش کے لحاظ سے بنائے تھے، مثلاً ایک ٹھمری ہے جس کے بول ہیں۔

چلم بھرت موری جر گئی چُنریا

اس میں نہ خدا کی تعریف ہے نہ بادشاہ کی تعریف ہے۔ ایک بھولی سی اور

بھلی سی بات ہے۔

ارتقائی مدارج

نظام موسیقی کے اس پہلے سے خاکے کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے گانے کے ارتقائی مدارج پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ دیوتاؤں کی ان محفلوں سے لے کر جب کہ برہما دیوتا بین بجاتے تھے، گنیش جی پکھاوج بجاتے تھے اور پاربتی جی ناچتی تھیں، آج کی ان محفلوں تک جب کہ گانا بجانا عموماً اک شغل بیکاراں ہو کر رہ گیا ہے۔ ہزارہا سال کی اتنی بڑی تاریخ ہے کہ وہ پوری طرح ذہن میں بھی نہیں آتی۔ بہر حال مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان کا گانا انتہائی ترقی پر تھا۔ جو کتاب بھی دیکھی اس میں یہی پایا کہ "سلاطین ہنود" میں گانے کی بڑی قدر و منزلت تھی اس زمانہ میں بڑے بڑے نائک ہوتے تھے۔ اور وہ یا رشیوں منیوں کی کٹیا میں ملتے تھے یا راجہ مہاراجہ کے دربار میں مسلمانوں کے آنے کے بعد بھی فقراء کے ذوق اور اُمراء کے شوق کے ہاتھوں ایسی ہی بارگاہوں میں گانے کی سرپرستی ہوتی رہی، یہاں تک کہ امیر خسرو نے جو درویش بھی تھے اور درباری بھی، نغمۂ فارسی کے ماہر بھی تھے اور نغمۂ ہندی کے دلدادہ بھی، علاء الدین خلجی کے زمانہ میں ہندی اور فارسی نغموں کے امتزاج سے اس گائکی کی بنیاد ڈالی جو ہندو مسلمانوں کا ایک مشترکہ سرمایۂ فخر و افتخار ہے اور اس دن سے آج تک ترقی ہی کرتا رہا ہے۔ زمانہ کی کوئی بھی چل پھل گانے میں ہندو مسلمان کا رخنہ نہ ڈال سکی۔

خسرو کے زمانہ میں ہندوستان کا سب سے بڑا ماہر موسیقی گوپال نائک تھا جس تخت پر اس کی سواری نکلتی تھی وہ سنگیت سنگھاسن کہلاتا تھا۔ اسے چالیس کلاکار

اپنے کندھوں پر لئے رہتے تھے۔ جب علاءالدین خلجی نے اس صاحب کمال کو اپنے
دربار میں آنے کی دعوت دی تو اس نے بحسن وخوبی انکار کر دیا۔ اس لئے کہ دربار
شاہی کے قواعد اور تھے اور گوپال نائک کے فقیرانہ اصول اور۔ آخر
علاءالدین خلجی نے امیر خسرو کی درخواست پر گوپال نائک کو درباری پابندیوں
سے مستثنیٰ کر دیا اور گوپال نائک کو سنگیت سنگھاسن اسی قدر و منزلت کے ساتھ
علاءالدین خلجی کے دربار میں لایا گیا، جس طرح وہ کہیں اور رہا کرتا تھا۔ اس
صاحب کمال کو سننے کے لئے سات دن کا دربار منعقد ہوا جس میں تخت شاہی
پر علاءالدین خلجی بیٹھا تھا اور سنگیت سنگھاسن پر گوپال نائک اپنی درویشانہ شوکت
و فن کا ناز و وقار کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ یہ سنگھاسن کتنا بڑا تھا اس کا اندازہ
اس سے ہو سکتا ہے کہ امیر خسرو سات دن کی اس محفل میں چھ دن اسی سنگیت
سنگھاسن کے نیچے چھپے بیٹھے رہے اور گوپال نائک کے رموز موسیقی اپنے بے پناہ
حافظے میں محفوظ کرتے رہے۔ ساتویں دن کی محفل میں امیر خسرو ظاہر ہوئے اور
گوپال نائک سے ان کا تعارف ہوا تو اس نے امیر خسرو سے گانے کی فرمائش
کی۔ امیر خسرو نے کہا میری کیا مجال کہ میں آپ جیسے ماہر فن کے سامنے نغمۂ ہندی
چھیڑوں مگر تعمیل ارشاد فرض ہے اس لئے جو آپ سے سنا ہے وہی پیش کرتا
ہوں۔ اور یہ کہہ کر امیر خسرو نے یکے بعد دیگرے وہی راگ شروع کئے جو گوپال
نائک نے سنائے تھے۔ نائک ہند خسرو کے راگوں کی سچائی پر حیران رہ گیا۔
آخر اس نے کہا اب آپ کوئی اپنا راگ سنائیے اور خسرو نے وہ راگ چھیڑا
جو خیال تھا۔ پچھلے دنوں کی محفل میں انھوں نے گوپال نائک کو سنتے اور راگ گاتے

ہندی میں نغمۂ فارسی کی آمیزش سے تیار کیا تھا۔ یہ دوآتشہ گوپال نائک کو اتنا
پسند آیا کہ وہ اپنے سنگیت سنگھاسن سے اتر پڑا اور اس نے امیر خسرو کو جو غالباً
زمین پر بیٹھے گا رہے تھے، وہاں سے اٹھا کر اپنے تخت پر بٹھا لیا اور کہا کہ نائک
کا لقب تم ہی کو زیب دیتا ہے۔ ہندوستانی گانے کی بنیاد اسی روز پڑی۔
امیر خسرو نے کیا ایجادیں کیں۔ یہ بہت بڑا موضوع ہے۔ مختصر یہ کہ دھرپد کی
جگہ جس سے پہلے بے بول کی بھی گائی جاتی تھی، امیر خسرو نے خیال ایجاد کیا۔ دھرپد
میں چار ٹکڑے ہوتے تھے وہ پکھاوج پر گایا جاتا تھا اور اس کی گائیکی اتنی
پیچیدہ تھی کہ دھرپد گانے والا بڑی دیر میں جم پاتا تھا۔ خیال میں امیر خسرو نے
دو ٹکڑے رکھے اور گائیکی میں ایسی تراش خراش کی کہ خیال گانے والا جلد ہی
جمنے لگا۔ اس کی سنگت کے لیے امیر خسرو نے ستار ایجاد کیا۔ خسرو کے بعد سلطان شرقی
نے جس کا دارالسلطنت جونپور تھا اور علاقہ ان کی بہار سے اودھ تک رہی ہے، خیال
کو کافی ترقی دی اور نئی نئی ایجادیں کیں۔ یہ سلطان شرقی جو نائکان ہند میں
شمار کیا جاتا ہے، غالباً آخری شرقی بادشاہ تھا اس لیے کہ بعض کتابوں میں سلطان
حسین شرقی لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا پورا نام حسین شاہ بن محمود تھا جس
کی سلطنت ۱۴۵۸ء سے ۱۴۷۹ء تک رہی ہے۔ یہ چھوٹی سی بادشاہت کب کی
مٹ گئی مگر اس کا نام ہندوستان کے سنگیت میں آج بھی عزت سے لیا جاتا ہے
اور ہمیشہ لیا جائے گا۔ بہرحال سلطان شرقی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ خیال
کی ایجاد ہوتے ہی وہ دلی سے اودھ اور جونپور میں لے آیا جو ہمارے اتر پردیش
کے علاقے ہیں۔

سلطان شرقی کے بعد سنگیت اور اتر پردیش کا سب سے بڑا مربی اکبر ہوا جس نے دلی کے بجائے آگرہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اکبر کے زمانہ میں۔

۱۔ تان سین گور (برہمن) ساکن گوالیار شاگرد ہرداس سوامی۔

۲۔ برج چند (برہمن) ساکن ڈانگر، نواح دہلی

۳۔ راجہ سموکھن سنگھ (راجپوت) ساکن کھنڈار اور

۴۔ سری چند (راجپوت) ساکن نوہار۔

چار استاد فن موسیقی مسلمان ہو گئے۔ دربار شاہی میں شامل ہوئے اور کلاونت کا خطاب پایا۔ ان میں سے تان سین کے علاوہ جو ایک فقیر کے شاگرد تھے، باقی تینوں اپنے گھرانے کے سیکھے ہوئے تھے ان ہی سے یہ چار بانیاں نکلی ہیں:۔

گوبرہاری، ڈانگری، کھنڈاری اور نوہاری۔

تان سین کی اولاد سے تان ترنگ خاں و بلاس خاں ہوئے ہیں، جن کی بانی گوبرہاری ہے۔ سموکھن سنگھ کی اولاد سے جن کی شادی تان سین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی امیر خاں وغیرہ کا خاندان چلا ہے۔ سموکھن سنگھ بین کے بڑے ماہر تھے۔ اکبر نے انھیں نوبات خاں کا خطاب دیا تھا۔ اور ان کی اولاد میں بڑے بڑے بین کار ہوئے ہیں ان کی بانی کھنڈاری ہے۔ برج چند سے یوسف خاں اور وزیر خاں کا سلسلہ چلا۔ ان کی بانی ڈانگری ہے۔ سری چند سے تان رس خاں کا خاندان ہے۔ ان کی بانی نوہاری ہے۔ خاندان کلاونتاں کے ان چار بانیوں کے علاوہ اکبر کے زمانہ میں

بیجو باورا اور گوپال لال نام کے دو اور ماہران موسیقی تھے جن میں سے بیجو باورا گنی اور گوپال لال "نائک" کے درجے پر پہونچے ہوئے تھے۔ یہ دونوں "خاں" از طمع تھے الاّ دام محبت شاہ عصر میں نہ پھنسے۔ تو سین کی عبادت پر ظاہر کرنے کے لیے بجنسہ نقل کی گئی ہے کہ اُس زمانہ میں مسلمان ہونے نہ ہونے کو اہل فن کس نظر سے دیکھتے تھے۔

میران مرد نائک بھی جن کا اصل نام نظام الدین تھا اور بلگرام کے رہنے والے تھے، اکبر ہی کے زمانہ میں ہوئے ہیں۔ یہ بھی فقیر منش تھے۔ چنانچہ درباری نہ بنے۔

آج کل جو گھرانے مشہور ہیں، مثلاً

گوالیار کا گھرانا۔ جے پور کا گھرانا، دلی کا گھرانا، آگرہ کا گھرانا۔ اور کرانا گھرانا، ان میں بیشتر کا سلسلہ عہد اکبر کے ان ہی کلاونتوں سے ملتا ہے۔

گوالیار کا گھرانا۔ حدو خاں، رحمت خاں، نثار خاں، شنکر پنڈت وغیرہ سے مشہور ہوا ہے۔ اور رام پور کے اُستاد مشتاق حسین بھی اسی گھرانے کے نمائندہ ہیں

جے پور کا گھرانا۔ اس کی دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک پٹیالہ گھرانا جو علیا اور فتو خاں سے چلتا ہے اور تان رس خاں تک پہنچتا ہے۔ دوسرا اللہ دیا کا گھرانا ان کا سلسلہ تان رس خاں سے ملتا ہے مگر اللہ دیا نے اپنی طرز الگ نکالی۔ اس لئے یہ ان کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ان میں سے بڑے غلام علی پٹیالہ گھرانے اور کیسر بائی کیرکر اللہ دیا گھرانے کی نمائندگی کرتی ہیں۔

دِلّی گھرانا بھی تان رس خاں سے چلتا ہے۔ مگر آج کل اسکی گائکی مفقود ہے۔
آگرہ گھرانا بھی غالباً تان رس خاں سے چلتا ہے۔ اس لئے کہ آگرہ اور دلی کی گائکی بہت ملتی جلتی ہے۔ بہرحال دھگّے خدا بخش خاں سے یہ آگرہ گھرانے کے نام سے مشہور ہوا۔ آفتاب موسیقی فیاض خاں جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، اسی گھرانے کے گانے والے تھے۔ آج کل ولایت حسین خاں اس گھرانے کے نمائندہ ہیں۔
کرانا گھرانا۔ اس گھرانے کا سلسلہ نہیں ملتا۔ بہرحال خاں صاحب عبدالکریم خاں جو اس دور کے مشہور معروف گانے والے ہوئے ہیں۔ اسی گھرانے کے گائک تھے۔ ان کے ریکارڈ تو سب ہی نے سنے ہوں گے مگر ان کی شبیہ بھی بہتوں نے دیکھی ہوگی اس لئے کہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اگر کا مجسمہ بہت ہی نمایاں جگہ پر نصب ہے۔

آج کل اس گھرانے کی نمائندگی ہیرا بائی بڑودکر کرتی ہیں۔

اکبر کے زمانے میں خیال کی گائکی اس عروج کو پہونچی کہ واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ تک اس کا زور قائم رہا۔

واجد علی شاہ شاعر بھی تھے اور رنگین بھی۔ اسلئے ان کے زمانہ میں خیال سے بھی زیادہ عام فہم چیزیں ٹھمری ودادرے اور غزل گانے کا رواج پڑا۔ چنانچہ آج کل گانے کی عام محفلوں کا نصاب جو بالترتیب خیال، ٹھمری، دادرے، اور غزل گانے پر مشتمل ہے وہ انہیں اودھ ہی کے ذوق و شوق کی یادگار ہے۔ یہ گانا اچھا ہے یا برا یہ الگ بحث ہے، لیکن آج کا مقبول عام گانا یہی ہے۔

شاہراہ ۱۹۵۱ء

ولایت خاں

ولایت خاں ستار نواز ہندوستان کے اُن چند فن کاروں میں ہیں جن کی مہارت فن کو دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں تاروں کے نغمے کا مستقبل بہت روشن ہے۔ آپ کے ساتھ جن دوسری ہستیوں کے نام لیے جاسکتے ہیں وہ علی اکبر اور روی شنکر ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ تینوں فن کار اُتر پردیش ہی کے رہنے والے ہیں۔

ولایت خاں کا پورا نام ولایت حسین خاں ہے مگر اس نام کے ایک مشہور گانے والے بھی بقیدِ حیات ہیں جو اُستاد ابن اُستاد ہیں اور ان کا سلسلہ گھگّے خدا بخش سے ملتا ہے جن سے آگرہ گھرانے کی گائکی چلی ہے۔ اس لیے ستار نواز ولایت حسین خاں نے اپنے نام میں عمداً اختصار کر دیا ہے اور وہ اپنی شہرت صرف ولایت خاں کے نام سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ولایت خاں کے والد عنایت خاں اور ان کے دادا امداد خاں تھے جو

راجا اندور کے منھ چڑھے درباریوں میں تھے، اور ان کے اُستاد بھی۔ عنایت
خاں کا ستار سننے والے اور اُن کے فن کی داد دینے والے ابھی بہت سے موجود
ہیں۔ انھیں انتقال کیے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ شاید ۱۹۳۸ء میں
انھوں نے انتقال کیا اس وقت ولایت خاں کی عمر صرف دس سال کی
تھی مگر وہ اپنے والد سے اتنا ستار سیکھ چکے تھے کہ اس بچپنے میں بھی ان کا ایک
ریکارڈ لے لیا گیا تھا جس میں ولایت خاں نے ٹوڑی کا خیال بجایا ہے۔

ولایت خاں نے ابھی حال میں ایک گشتی خط جاری کرکے آل انڈیا
ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے درخواست کی ہے کہ اس ریکارڈ کا بجانا بند کر دیا
جائے۔ اس لیے کہ ولایت خاں کے نزدیک اس میں بچپنا پایا جاتا ہے، اور
چونکہ اس ریکارڈ کے ساتھ یہ اعلان نہیں کیا جاتا ہے کہ اُن کے بچپنے کا ریکارڈ
ہے اس لیے لوگوں کو دھوکا ہو سکتا ہے اور وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ولایت خاں آج
بھی ٹوڑی کا خیال اسی طرح بجاتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ نہیں ہے کہ ولایت خاں کو اپنے بچپنے کے ریکارڈ میں
شتی کی جھلک نظر آتی ہے بلکہ یہ ہے کہ تقریباً بیس سال سے یہ ریکارڈ ہندوستان
میں بج رہا ہے مگر آج تک کسی صاحب فن کو اس میں خامی نہیں نظر آئی کہ وہ
آل انڈیا ریڈیو کو توجہ دلاتا، یا کوئی صاحب ذوق سننے والا اس کی شکایت
کرتا۔ یہ معمولی بات نہیں ہے اس لیے کہ دس سال کے سن میں ستار کو سنبھالنا
بھی مشکل ہوا کرتا ہے نہ کہ اس پر ایک ایسا نغمہ بجانا جو اُستادوں کے ساتھ نشر
کیا جاتا رہے۔

اس فطری صلاحیت کے باوجود ولایت خاں نے کسب کمال میں بڑا ریاض
کیا ہے۔ باپ کا سایہ اُٹھ جانے کے بعد ہونہار لڑکوں میں عموماً ایک نیا جذبہ پیدا
ہو جاتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں سہارا دینے والا تو کوئی ہے نہیں، ہماری
سرپرستی کرنے والا تو کوئی رہا نہیں اب جو کچھ ہے وہ ہم کو خود ہی کرنا ہے۔ اس لیے
جو ذرا سا بھی رُخ دیتا ہے ذرا سی بھی شفقت کرتا ہے وہ اُس کے پیروں میں لپٹ
جاتے ہیں اور اسکی ذرا سی توجہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش
کرتے ہیں۔ کم از کم ولایت خاں پر اُن کے باپ کے مرنے کا یہی اثر ہوا، اُن کی
ماں نے جو بفضلہ آج بھی حیات ہیں ولایت خاں کو باپ دادا اور دوسرے اُستادوں
کے کمالات کے قصے سنا سنا کر اُن میں ایک نئی روح پھونک دی، حسن اتفاق کہ
ولایت خاں کی ماں کو قصے کہانیاں ہی نہیں آتی تھیں اپنے شوہر اور سسر کا
فن بھی اتنا آتا تھا کہ وہ خود اپنی نگرانی میں ولایت خاں کو ریاض کراتی تھیں
اور آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے اپنے بیٹے کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔

ولایت خاں کا بیان ہے کہ اُن کی والدہ کا ذہن اتنا اچھا ہے اور اُن
کی طبیعت اتنی موزوں ہے کہ جب وہ بتاتی تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے
اُنھوں نے والد صاحب کے سارے کمالات کا چربا اُتار لیا ہے۔

ہندوستان کا شاید ہی کوئی فن کار ہو جس کو ولایت خاں کی ماں نے عنایت خاں
کی زندگی میں نہ سنا ہو، اس لیے کہ سب ہی اُستادوں کا ان کے یہاں آنا جانا رہتا
تھا، اور گانے بجانے کی محفلیں برابر ہوا کرتی تھیں۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ایک
پردہ نشین خاتون دروازے کے پٹ سے لگی بیٹھی ہے اور ٹیپ ریکارڈ کی طرح

ہر چیز اپنے دل پر نقش کرتی جا رہی ہے۔ قدرت نے اُس کو بلا کا حافظہ دیا ہے اس
لیے کہ آگے چل کر اسی کے ہاتھوں اُسے ایک ایسے بچے کی تربیت کرانا ہے۔ جو
بیک وقت ان تمام استادوں کے کمالات کو ہندوستان میں پھر سے
زندہ کرے گا۔

باپ نے ولایت خاں نے صرف اتنا سیکھا تھا کہ ستار پر ہاتھ کیسے رکھے
جاتے ہیں۔ داہنے ہاتھ کی کیا گرفت ہے اور بائیں ہاتھ کی کیا گرفت ہو۔
بظاہر یہ کچھ بھی نہیں ہوا، لیکن ولایت خاں کہتے ہیں کہ یہی وہ راز
سربستہ ہے جسے علم سینہ کہتے ہیں۔ اور یہ علم سینہ مجھے والد صاحب نے بچپن ہی
میں تفویض کر دیا تھا۔ رہا معلومات حاصل کرنا اور ریاض کرنا تو اس کا سلسلہ
بقول ولایت خاں ساری عمر جاری رہتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ جس اُستاد کی بھی خدمت میں مجھے بیٹھنے کا موقع ملا میں نے
کوشش کی کہ اُس سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کروں۔ حافظہ اُن کا بھی استاد تھا ہر
ایک بار بندو خاں سے ایک چیز سُنی جو اُنھوں نے یہ کہہ کر سنائی کہ بیٹا یہ کسی
کو نہیں حاصل ہے۔ ولایت خاں کو ایک ہی بار میں وہ چیز یاد ہو گئی۔ کہنے لگے
اُستاد یہ تو مجھے بھی آتی ہے۔ بندو خاں نے کہا "تجھے آتی ہے تو سُنا" ولایت خاں
نے فوراً وہ چیز سُنا دی۔

بندو خاں نے جھلا کر کہا "اچھا لے دوسری چیز سُن" ولایت خاں
نے پھر وہی حرکت کی۔ جب اُستاد سُنا چکے تو بولے "اُستاد یہ بھی مجھے آتی ہے اور
وہ چیز بھی صحیح صحیح سُنا دی۔ اب اُستاد سمجھ گئے کہ لڑکا اپنے حافظے کا کمال دکھا

رہا ہے۔ اور بڑی شفقت سے بولے "جیسا آج یاد ہے ویسا ہی ہمیشہ یاد رکھنا۔"

اسی طرح اُستاد فیاض خاں سے بھی ولایت خاں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے
کہتے ہیں ویسے تو میں نے اُن سے بہت سی چیزیں سُنیں۔ مگر ایک بار لکھنؤ میں
ان سے درباری سُنی تھی ویسی درباری نہ سُنی ہے نہ سنوں گا۔" ولایت خاں جب
درباری کا خیال بجاتے ہیں تو اس میں فیاض خاں کی ترکیبیں ضرور نکالتے ہیں۔

گانا سیکھنے کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ 'سیکھیا'، 'دیکھیا'، 'پرکھیا'۔ ان میں سے
سیکھنے اور دیکھنے کی منزلیں طے کر کے ولایت خاں ہندوستان کے فن کاروں
میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر چکے، اب وہ پرکھیا کی منزل میں ہیں۔ جہاں وہ
خود بھی اپنے فن کو پرکھ رہے ہیں اور دوسرے بھی اُن کے فن کو پرکھ رہے ہیں۔

اصل چیز فن کار کا خود اپنے فن کو پرکھنا ہے۔ دوسروں کا پرکھنا تو تعریف
و تحسین تک رہ جاتا ہے مگر اپنا پرکھنا فن کار کے فن میں نت نئے گل بوٹے کھلاتا
رہتا ہے۔ جس فن کار کی تنقیدی نگاہ جتنی تیز ہے اُس کا فن اتنا ہی کامل ہوگا۔

ولایت خاں میں تنقید و تجزیے کا بڑا مادہ ہے، وہ انگریزی بھی جانتے ہیں۔
یورپ کے مختلف ملکوں کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ صورت شکل، وضع قطع، بات
چیت سے نئی روشنی کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، اور ان میں یہ جذبہ بدرجہ اتم موجود
ہے کہ وہ پرانی چیزوں کو نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے پیش کریں۔ یہ اُمنگ
اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ اُن کا فن دن دونی رات چوگنی ترقی
کرے گا۔ سن و سال کو دیکھتے ہوئے بھی ولایت خاں کے فن سے جتنی بھی امیدیں
لگائی جائیں کم ہیں۔

ان کی مضراب میں عظمت بھی ہے اور لطافت و حلاوت بھی۔ ابھی حال
ں (اپریل میں) ولایت خاں نے بھات کھنڈے یونیورسٹی کے زیر اہتمام
صر باغ بارہ دری میں درباری کا خیال بجایا تو ساری محفل اس کی کلاسیکی
ظمت سے مبہوت ہو کر رہ گئی۔ جو تھا وہ اُن کے نغمے کی سحر آفرینی سے ایک
سکتے کے عالم میں تھا۔ فنی باریکیوں کو سمجھنا تو بڑی بات ہے مگر یہ سب ہی
کھ رہے تھے کہ اُن کی انگلیاں ایسی برق رفتاری اور سچائی کے ساتھ چل
ہی تھیں کہ مشین بھی کیا چلے گی۔ جب گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے بعد انھوں نے
رباری کا خیال ختم کیا تو سامعین نے ٹھمری کی فرمائش کی۔

ولایت خاں یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے کہ ذرا میں اپنے پیر سیدھے کر لوں تو ٹھمری
یش کروں۔ اس معذرت کی اہمیت شاید ہی کسی کے ذہن میں آئی ہو۔ بعد
معلوم ہوا کہ ولایت خاں نے اتنا ریاض کیا ہے اور ستار بجانے کے آسن سے
یٹھنے میں اپنے پیروں کو اتنا توڑا ہے کہ اب وہ مسلسل گھنٹہ دو گھنٹے ستار بجاتے
ہیں تو اُن کے پیر سُن ہو جاتے ہیں اور انھیں دورانِ خون ٹھیک کرنے کے
لیے تھوڑی دیر کھڑا ہو جانا پڑتا ہے۔

اس مشقت و ریاضت کا اثر اُن کے ہاتھوں پر بھی ہے۔ داہنا ہاتھ تو
تنا توانا ہو گیا ہے کہ داہنی طرف کی ہتھیلی کی ہڈیاں بھی موٹی ہو گئی ہیں۔
بایاں ہاتھ مقابلتہً کمزور ہے۔ اس کی انگلیوں کی شکل بدل گئی ہے اور
کلائی ہتھ کی ہڈیاں تو ایسی اُٹھی ہوئی ہیں جیسے ہارمونیم کے سُر کھول دیے
جاتے ہیں تو اُس کے پردے اُبھر آتے ہیں۔ یہ ریاض کرنا پڑتا ہے تب جاکر

ستار سا نازک ساز خواب میں آتا ہے۔

جب ولایت خاں نے ٹھمری شروع کی تو رات کے ڈھائی بجنے والے
تھے۔ بھات کھنڈے یونیورسٹی کے مہتمم اور نظامت اطلاعات کے ناظم شری
بھگوتی شرن سنگھ جو سرِ شام ہی سے محفل کے انتظام میں لگے ہوئے تھے اپنی
جگہ چھوڑ کر دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ اُن کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ
کسی کے لیے فرشِ راہ ہو رہی ہیں۔ اتنے میں اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر
سمپورنا نند جو دوسری مصروفیات کی بنا پر ڈھائی بجے رات سے پہلے نہیں
آسکتے تھے حسبِ معمول پابندیِ اوقات کے ساتھ ٹھیک وقت پر تشریف لاسکے۔
خیال ہوا منتظمین کی ہمت افزائی کے لیے آگئے ہیں۔ تھوڑی دیر تشریف رکھیں
گے پھر چلے جائیں گے مگر وہ صبح تک ہمہ تن گوش بنے رہے اور ماہرینِ فن کو داد
دیتے رہے۔ یہ قدر شناسی راجاؤں اور نوابوں کی اُس داد و دہش سے کہیں زیادہ
ہے جس نے فن کاروں کو تو مالا مال کر دیا مگر فن کی کوئی خدمت نہیں کی۔ اکبر سے
لے کر واجد علی شاہ تک کسی نے یہ نہ کیا کہ موسیقی کا ایک ادارہ قائم کرتا یا اس میں
تصنیف و تالیف کی سرپرستی کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انگریزوں کے منحوس قدم
آئے اور یہ محفلیں درہم برہم ہو گئیں تو ہندوستان کا فنِ موسیقی گلی گلی ٹھوکریں
کھانے لگا، اور آج جب اس کو فنی حیثیت سے زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی
ہے تو ایک ایسا سرا بھی نہیں ملتا جس کی مدد سے دھرپد کے قدیم زمانے سے لے کر
ٹھمری کے موجودہ زمانے تک کی فنی تاریخ کو سکھانے اور سنوارنے میں آسانی ہو۔

ہاں تو جب ولایت خاں نے ٹھمری شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

اک سیلاب نشاط ہے جو اُن کے ستار سے پھوٹ نکلا ہے اور ساری محفل کو اپنی لہروں پر جھولا جھلا رہا ہے۔ اُن کے ستار سے ایسے ایسے میٹھے بول نکل رہے تھے اور ایسی ایسی نازک ترکیبیں سُننے میں آ رہی تھیں کہ نزاکت، لطافت، شیرینی، حلاوت سب مل کر بھی اس کی ترجمانی نہیں کر سکتے۔

اس کمال قدرت، مقبولیت اور شہرت کے باوجود ولایت خاں یہ نہیں سمجھتے کہ وہ عروج کو پہنچ گئے ہیں، وہ اب بھی اپنے کو ایک متعلم سمجھتے ہیں اور یورپی فن کاروں کے نغمے سننے کے لیے بعض انگریزی فلموں کو بار بار دیکھتے ہیں۔ اور اُن کی آمیزش سے نئے نئے نغموں پر گھنٹوں، بلکہ بعض اوقات ہفتوں تجربے کیا کرتے ہیں ان تجربوں میں سے ایک نہ ایک ضرور کامیاب ہوگا اور ستار کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔

نیا دور ۱۹۵۶ء

ایک بار دیکھا ہے . . . . . .

ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔ یہ کہاوت اُن تمام لوگوں پر پوری اُترتی ہے جو ایک بار نینی تال ہو آئے ہیں دوبارہ جانے کے ہر سال منصوبے بناتے رہتے ہیں مگر نوبت نہیں آتی، کچھ ایسے بھی خوش نصیب ہیں جو ہر سال نینی تال جاتے ہیں۔ گرمیاں آئی نہیں اور انھوں نے تیاریاں کی نہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ نینی تال کے سلسلے میں یہ کہاوت یوں ہونا چاہیے کہ ایک بار دیکھا ہے بار بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ میرا بھی خیال ہے کہ نینی تال کی جلوہ سامانیوں کو کوئی دس بار میں بھی اپنی آنکھوں میں بھر لے تو بڑی بات ہے، ایک آدھ بار کا تو ذکر ہی کیا!

آپ کاٹھ گودام سے چلے نہیں کہ حیرانیاں شروع ہوئی نہیں۔ وہی پہاڑ جن کی دشوار گزاریوں کی کہانیاں ہم اپنے بچپن سے سنتے چلے آئے ہیں انسان کی جاں فشانی

ے ایسے بس گئے اور بن گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ کشتی بھی پانی میں کیا اس روانی
ے چلے گی جس روانی سے آپ کی موٹر نینی تال کی سڑک پر جاتی ہے سچ آپ
ہن میں سلوٹیں پڑ جاتی ہیں کھردرا پن آجاتا ہے، لیکن نینی تال کی سڑک شروع
ے آخر تک اتنی بھلی صاف اور شفاف ہے کہ کہیں ایک شکن بھی نظر نہیں
آتی ـــــ ایک ہچکولا بھی کسی جگہ نہیں لگتا۔ کیوں نہ ہو یہ دنیا کی بہترین
پہاڑی سڑکوں میں ہے ـــــ بائیس میل کی اس پُر پیچ چڑھائی میں آپ
ہر آن بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ یہ احساس خود اپنی جگہ پر کیا کم ہے
ابھی آپ کے داہنے ہاتھ پر غار تھا، بائیں ہاتھ پر پہاڑ تھا اتنے میں آپ کی
گاڑی مڑی، داہنے ہاتھ پر پہاڑ اور بائیں ہاتھ پر غار آگیا۔ بلندی و پستی
کے یہ نظارے آپ کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں اور آپ ایک
ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک پر ہر آن اپنی منزل کی طرف چڑھتے چلے
جاتے ہیں۔ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگتے کہ یہ مسافت طے ہو جاتی ہے اور
آپ سکون اور سناٹے کی طرف سے نکل کر چہل پہل کی دنیا میں آجاتے ہیں۔
آپ کی گاڑی بس کے ٹرمینس پر رکی نہیں کہ سامان اٹھانے والے
مزدوروں اور ہوٹل لیجانے والے گائیڈوں نے آپ کو اپنے حلقے میں لے لیا
مگر آپ ہیں کہ نہ اُن کی سُن رہے ہیں نہ اِن کی سُن رہے ہیں۔ بس جھیل کی طرف
دیکھے جا رہے ہیں۔ کیسے نہ دیکھیں؟ یہی تو وہ جھیل ہے جس نے نینی تال
کو جنت نگاہ بنا رکھا ہے۔ ہوٹل تو مل ہی جائے گا، گھر تو پہنچ ہی جائیں گے
کچھ دیر ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھالیں جن کے لیے آپ نہ جانے

کتنی دور سے آئے ہیں۔ شاید ہی کوئی سیاح ہو جو نینی تال پہنچتے ہی اس جھیل
کی رعنائیوں میں گم نہ ہو جاتا ہو، اور اگر کوئی ایسا ہو بھی تو میرے خیال میں
اس میں جھیل کا قصور نہیں ہے۔
اب آپ ۶۳۵۰ فٹ کی بلندی پر کھڑے ہیں۔ آپ کے سامنے پانچ سو
گز چوڑی اور ۱۵ سو گز لمبی جھیل ہے۔ اس کی ننھی ننھی لہریں آپ کے دل و
دماغ کو وہ تراوٹ پہنچاتی ہیں کہ آپ کی ساری تھکن آن کی آن میں دور
ہو جاتی ہے۔ جھیل کا یہ سرا جہاں آپ اترے ہیں تلی تال کہلاتا ہے۔ وہ
سرا جو یہاں سے دور پر دکھائی دے رہا ہے ملی تال ہے۔ بیچ کا حصہ نینی تال
ہے۔ یہیں ایک پہاڑی کے کنارے نینی دیوی کا مندر ہے۔ ظاہر ہے کہ
سب سے پہلے اسی مندر کے پجاریوں نے نینی تال کو باہر کی دنیا سے روشناس
کرایا ہوگا۔ اب یہ سارا علاقہ اسی نام سے دور دور مشہور ہے۔
آپ کے داہنے ہاتھ پر ایک چوڑی سی سڑک ہے جو جھیل کے کنارے
کنارے چلی گئی ہے۔ آپ جس ہوٹل میں بھی جائیں گے اسی راستے سے جائیں گے
جتنے اچھے اچھے ہوٹل ہیں سب کا راستہ اسی سڑک سے گیا ہے ـــــ
بڑے بازار کو بھی یہی راستہ گیا ہے۔ چھوٹا بازار تو آپ کی پشت ہی پر ہے۔
جھیل کا وہ سرا جو ملی تال کہلاتا ہے اور جہاں ایک اتنا چوڑا چکلا میدان ہے
کہ ہاکی میچ تک وہاں ہوتے ہیں اسی سڑک کے کنارے پر ہے۔ اس میدان
کے جانب پر مسجد بھی ہے "اسکیٹنگ ہال" بھی ہے۔ سنیما ہال بھی ہے۔ گھوڑوں
کا اڈہ بھی ہے۔ "بوٹ کلب" بھی ہے۔ غرض سب کچھ ہے۔ اس میدان کو جو

فلیٹ کے نام سے مشہور ہے نینی تال کا قلب کہیے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ کو جس سے بھی ملنا ہو شام کو اس فلیٹ پر اُتر آئیے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر چہل قدمی کیجیے، یا کشتی پر بیٹھ کر جھیل کا ایک چکر کاٹیے واپسی پر اُن سے ضرور ملاقات ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ میدان ایک ایسی نعمت ہے جو ہر پہاڑ پر نصیب نہیں ہوتی۔ اس لیے کوئی کہیں بھی رہتا ہو وہ شام کو فلیٹ پر آنا ایک دستور بنا لیتا ہے۔ آپ یہاں ہر ایک سے آسانی سے مل سکتے ہیں۔ یہی نہیں اگر آپ چھ سات روز برابر فلیٹ پر آتے رہیں تو نینی تال کے جتنے بھی نو وارد ہیں سب آپ کی نظروں میں چڑھ جائیں گے۔ سب سے آپ کا ایک خاموش تعارف ہو جائے گا۔ ممکن ہے آپ کی وضع قطع دوسروں کو اچھی لگے۔ دوسروں کی چال ڈھال آپ کو پسند آئے وہ آپ سے مانوس ہو جائیں، آپ اُن سے مانوس ہو جائیں۔ پھر کسی دن اگر ایسا ہوا کہ آپ فلیٹ نہ آئے یا وہ فلیٹ نہ آئے تو دونوں کی نظریں ایک دوسرے کو ڈھونڈھتی رہیں گی۔

مان لیجیے کہ آج ایک ایسی ہی شام ہو آپ فلیٹ گھوم کر واپس جا رہے ہیں اور راستے میں چڑھائی کی مشقت کو بھلانے کے لیے آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں کہ آج انھیں نہیں دیکھا، انھیں نہیں دیکھا۔ اتنے میں آپ رُکے اور آپ کی نظر جھیل پر پڑی تو آپ کو اُس کے ٹھہرے ہوئے پانی میں مقابل پہاڑیوں کا ایک ایسا عکس نظر آئے گا کہ اپنے شہر کی دیوالی یاد آ جائے گی۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے نینی تال کے سارے چراغ تہہ آب روشن ہیں۔ اور اگر حسن اتفاق سے چاندنی رات ہوئی تو کہنا ہی کیا ہے۔ ایک چاند آسمان پر دکھائی دے گا دوسرا جھیل

میں نظر آئے گا۔ آگرے کے تاج محل کو آپ نے چاندنی میں نہاتے دیکھا ہوگا آج خود چاند کو نینی تال کی جھیل میں نہاتے دیکھ لیجیے۔ یہ وہ جھیل ہے جس کے لیے چاند اور ستارے بھی آسمان سے اُتر آتے ہیں۔

اگر آپ کو چڑھائیاں چڑھنے اور فلک بوس چوٹیاں دیکھنے کا شوق ہے تو یہیں دو قدم پر "چینا پیک" کی چڑھائی ملے گی جو نینی تال سے بھی ۲،۲۰۹ فٹ زیادہ ہے۔ یہاں سے آپ کو ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں ایسی حسین نظر آئیں گی کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ رانی کھیت بھی یہاں سے صاف دکھائی دیتا ہے۔ وہ ۵،۹۸۳ فٹ ہے۔ آپ ۷،۶۵۹ فٹ کی بلندی پر کھڑے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ رانی کھیت کو کچھ کم سمجھیے۔ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔ رانی کھیت ضرور جائیے۔ ابھی کچھ دن ہوئے امریکہ کے ایک چیف جسٹس مسٹر ولیم ڈگلس وہاں گئے تھے تو انھوں نے فرمایا تھا کہ رانی کھیت دنیا کے بہترین مقامات میں ہے۔ پھر آپ بھی ایک نظر رانی کھیت کیوں نہ دیکھیے۔ وہی تلی تال سے بس مل جائے گی جہاں آپ اترے تھے۔ اب تو بسوں کا ایسا انتظام ہے کہ آپ اس پہاڑی علاقے میں جہاں چاہیں آسانی سے جا سکتے ہیں، پھر کیا تکلف ہے لگے ہاتھوں رانی کھیت بھی سہی۔ یہاں آپ کو دو بستیاں نظر آئیں گی۔ ایک وہ جو انگریزوں نے اپنے لیے بسائی تھی۔ اس میں چھاؤنی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹل ہیں۔ اچھی سے اچھی سڑک ہے، کلب ہے، باغ ہے، غرض سب کچھ ہے۔ دوسری وہ بستی جو اصل بستی تھی۔ یہ آثار پر واقع ہے جو اترتے اترتے گالف گراؤنڈ تک پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نہ عالیشان

عمارتیں ہیں نہ عمدہ سی سڑک ہے، نہ ویسی صفائی ہے۔ مگر آب و ہوا پر ان کا کیا اختیار تھا وہ یہاں بھی اچھی ہے وہاں بھی اچھی ہے۔

جو لوگ صرف آرام و صحت کے خیال سے پہاڑ پر جاتے ہیں انھیں نینی تال کے مقابلے میں رانی کھیت زیادہ پسند آئے گا۔ خصوصاً اب جب کہ وہاں بجلی بھی لگ گئی ہے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ انگریزوں نے یہ سارا علاقہ صرف ۳۰۲۴ روپے میں خریدا تھا۔ وہ اپنی فوج کے صدر مقام کو شملے سے ہٹا کر رانی کھیت لانا چاہتے تھے۔ مگر لارڈ میو جو اس زمانے میں وائسرائے تھے انڈمن میں مار ڈالے گئے، اور رانی کھیت صرف چھاؤنی بن کر رہ گیا۔ ورنہ آب و ہوا، حسین مناظر اور اس کے ہموار اُتار چڑھاؤ کا تقاضہ تھا کہ رانی کھیت کو ہر پہلو سے ترقی دی جاتی۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے آزادی کے بعد وہاں بڑے انتظام و اہتمام کے ساتھ بجلی پہنچائی گئی ہے جس کے نئے نئے کھمبے آپ کو راستے بھر نظر آئیں گے۔ چوبٹیاں میں پھلوں کی ترقی کے لئے باغ لگائے گئے ہیں۔ یو پی کوآپریٹیو ورکس فیکٹری کھولی گئی ہو جس میں نئے نئے طریقوں سے کھلونے اور مجسمے تیار ہوتے دیکھ کر ایک خاص لطف آتا ہے۔

اس فیکٹری کو آپ رانی کھیت کی پہلی ڈیوڑھی سمجھیے۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور چل کر آپ کی بس رک جائے گی اور آپ رانی کھیت پہنچ جائیں گے۔

بس سٹینڈ کے پاس ہی ایک طرف آپ کو سستے سے ہوٹل نظر آئیں گے۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی خوب صورت عمارت میں ٹورسٹ بیورو

ملے گا، یہاں آپ ہر ضروری معلومات بلا زحمت حاصل کر سکتے ہیں۔ کون ہوٹل کس درجے کا ہے اور اس کے مناسب ریٹ کیا ہیں۔ چوبٹیا جانے کے لیے آپ کو کس وقت گاڑی ملے گی۔ وغیرہ وغیرہ ——

رانی کھیت کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہمالیہ کے منظر دیکھنے کے لیے یہاں آپ کو چینا پیک کی چڑھائی پر چڑھنے کی ضرورت نہیں ہے جہاں سے چاہیے ہمالیہ کا نظارہ کر لیجیے۔

(آواز ستمبر [illegible])

کدمبہ کی چھاؤں

ہندوستان کی قدیم تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ساری تہذیب درختوں کے سائے اور کھیتوں کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہے۔

کہیں ایک خوش حال اور فارغ البال راجہ جنگل میں منگل منا رہا ہے تو کہیں ایک خوش خیال و نیک خصال شہزادہ راج پاٹ کو چھوڑ بستی سے جنگل کو منہ موڑ تیاگ اور تپسیا کی دھونی رما رہا ہے۔ کہیں مُرلی والے شیام پریم اور پریت کی بنسی بجا رہے ہیں تو کہیں سیتا اور رام بن بن میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کہیں آریاؤں کے ڈیرے جمے ہوئے ہیں تو کہیں مغلوں اور یونانیوں کے غول اُتر رہے ہیں۔ کوئی بھولا بھٹکا ادھر آ نکلا ہے تو کوئی سوچ بچار کر وہاں سے یہاں پہنچا ہے۔ کسی کے ہاتھ خالی ہیں تو کوئی سارا علم و ہنر ساتھ بھی لیتا آیا ہے۔ بہرحال جو قافلہ بھی یہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ گیا ہے وہ یہاں کے

لہلہاتے کھیتوں، گنگناتے دریاؤں، چہچہاتے جنگلوں، لق و دق میدانوں اور فلک بوس پہاڑوں کے حُسن جمال سے ایسا متاثر ہوا ہے کہ اُس نے ایک اطمینان کی سانس لی ہے، چمن آرائی قدرت کی داد دی ہے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کا ہو گیا ہے۔

قدرت کی یہ مہربانیاں اور فیاضیاں صرف فخر و مباہات کے لیے نہیں بلکہ اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ جغرافیائی حالات ہر مُلک کی تہذیب کو بنانے میں ایک بُنیادی دخل رکھتے ہیں۔ جو خطۂ ارض نوازشات قدرت سے محروم رہا ہے، جیسے مغرب وہاں انسان اور طبعی حالات میں مسلسل کشمکش ہوتی رہی ہے، اور تسخیر فطرت ہی وہاں انسان کا مقصد حیات بن گیا ہے۔ مگر جو ان نوازشات سے مالا مال رہا ہے جیسے ہندوستان، وہاں موسم کی موافقت، زمین کی زرخیزی اور جوش نمو کی برکتوں کی وجہ سے انسان کو فطرت سے جنگ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ چنانچہ اُس کا بنیادی شعور قدرت سے لڑنا نہیں بلکہ اُس کے گیت گانا ہے۔ ہندوستان ایک ایسا خوش نصیب خطہ ہے جس میں وہ چیزیں جو انسان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتی ہیں مثلاً آتش فشاں پہاڑ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں اور وہ جو انسان کی اعانت کرتی ہیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ موسم بھی وقت سے آتے ہیں، وقت سے جاتے ہیں اور اعتدال کی حد سے کہیں بھی نہیں گزرتے اس لیے ہندوستان کے ذہن میں قدرت کے جتنے مشاہدات ہیں وہ سب خدا کی رحمتیں ہیں۔ پہاڑ ہیں تو ایذا رسانی کے لیے نہیں پاسبانی کے لیے، دریا ہیں تو طغیانی کے لیے نہیں آبیاری کے لیے، جنگل ہیں تو خوف و دہشت کے لیے نہیں

موسم میں اعتدال لانے اور پریم اور پریت کی نفسی بچانے کے لیے۔

جب طبعی ماحول سازگار ہو تو انسان محنت کے بجائے فکر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ مشرق و مغرب کے مزاج میں جو تضاد ہے وہ قدرت کی انھیں مہربانیوں اور نامہربانیوں کا نتیجہ ہے جب کہ مغرب کا انسان نامہربانیِ قدرت سے لڑتا رہا ہے اور اس طرح محنتی جفاکش اور مادہ پرست بنتا گیا ہے۔ مشرق کا انسان ہر چہار طرف شکر و احسان کے سجدے کرتا رہا ہے اور مظاہرِ قدرت سے عقیدت و محبت کے نت نئے رشتے جوڑتا رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی تہذیب میں مذہب کو اور معتقداتِ مذہب میں شجر و حجر کو ایک بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہوتی گئی ہے۔ ویدوں اور پرانوں کی تعلیمات درختوں اور پودوں کے ساتھ ایسے برتاؤ کی ہدایت کرتی ہیں جیسے وہ ذی روح ہیں۔ ([illegible]) متسیہ پران میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایک درخت لگانا دس نیک لڑکے پیدا کرنے کے برابر ہے۔

جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس کا فلسفہ ذہن سے اترتا گیا اور اس کی جگہ توہم پرستی بڑھتی گئی یہاں تک کہ شجر و حجر کی جو قدر ہے وہ ایک بے سوچی سمجھی پرستش سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن پرانے زمانے میں جب ہماری زراعتی زندگی آج کی سی بیوپارانہ ذہنیت سے آلودہ نہیں ہوئی تھی۔ انسان اپنے پیشے کے لحاظ سے بھی درختوں کے مرتبے کو سمجھتا تھا اور عقیدے کے لحاظ سے بھی۔ چنانچہ اسے ہندوستان کی تہذیب میں صدیوں ایک غیر معمولی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بودھ آرٹ کا تو مستقل موضوع برگد کا پیڑ ہے۔ صرف اس لیے نہیں

کہ مہاتما بدھ نے ایک برگد ہی کے نیچے تپسیا کی تھی اور نروان حاصل کیا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ برگد کو ہندوستان میں ہمیشہ سے ایک خاص تقدس و عظمت حاصل رہی ہے۔ ہندو عقیدے میں برگد ہی وہ درخت ہے جو ساری دنیا کے فنا ہو جانے کے بعد بھی باقی رہ جائے گا۔ شاید اسی روایتی عظمت نے مہاتما بدھ کو برگد کے نیچے تپسیا کرنے پر مائل کیا ورنہ وہ کسی اور درخت کو بھی چن سکتے تھے۔ بہرحال جب سے مہاتما بدھ نے برگد کو ایک نئی عزت بخش دی اس وقت سے اس کی داشت و پرداخت پر خاص توجہ کی جانے لگی ہے یہاں تک کہ اشوک نے متعدد فرمانوں میں درختوں کے بارے میں عموماً اور برگد کے بارے میں خصوصاً احکام صادر کیے ہیں۔ ایک جگہ اشوک نے لکھا ہے کہ ایک راجہ جو اچھے سے اچھے کام کر سکتا ہے ان میں سب سے اچھا کام درخت لگانا ہے۔ جب سکندر ہندوستان آیا تو یہاں اتنے بڑے بڑے برگد کے درخت تھے کہ انھیں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ آج بھی دو درخت قابلِ دید ہیں۔ ایک کلکتے کے بوٹینیکل گارڈن میں اور دوسرا وہ جو کولمبو میں ہے۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے نیچے ہزاروں خیمے نصب کیے جا سکتے ہیں۔

ساوتری کی جاں نثاری

ساوتری اور ستیہ وان کی داستانِ محبت بھی برگد ہی سے وابستہ ہے کہتے ہیں کہ جب موت کے دیوتا نے ستیہ وان کی روح سلب کر لی اور وہ اسے لے کر اپنے مستقر نرک (جہنم) کی طرف چلا تو ساوتری بھی اس کے ساتھ ستی

ونے کے لیے چل کھڑی ہوئی۔ موت کے دیوتا نے کہا "جا اپنی راہ لے اس کا
پیچھا نہ کر۔" ساوتری نے جواب دیا "ان کے بغیر یہ دُنیا میرے لیے جہنم سے
بدتر ہے میں ساتھ ہی چلوں گی۔" دیوتا نے کہا "جو مانگ میں تجھے دینے کو
تیار ہوں مگر ساتھ نہ آ۔" ساوتری نے پہلے تو ستیہ وان کے ماں باپ کی آنکھیں
مانگیں پھر اُن کا راج پاٹ مانگا (یہ دونوں نعمتیں ان سے ایک سراپ کے
نتیجے میں چھین لی گئی تھیں) آنکھیں بھی روشن ہو گئیں اور راج پاٹ بھی مل گیا۔
مگر ساوتری نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں نرگ کے دروازے
پہنچ گئے۔ جب موت کے دیوتا نے دیکھا کہ یہ تو سائے کی طرح پیچھے لگی ہوئی ہے
تو اُسے خیال ہوا کہ کہیں ساوتری نرک کے اندر ہی نہ چلی آئے جس کے نتیجے میں
نرک بھی سورگ بن جائے۔ چنانچہ اُس نے ساوتری سے ایک اور مانگ پوری کرنے
کا وعدہ کیا۔ اب کی ساوتری نے لڑکا مانگا۔ دیوتا نے جھنجھلا کر کہا "جا تجھے لڑکا
بھی دیا۔" ساوتری بولی "جب تم نے لڑکے کی مانگ پوری کر دی تو پھر میرے
پتی کو کہاں لیے جاتے ہو؟" موت کا دیوتا لاجواب ہو گیا اور اُس نے ستیہ وان
کی روح کو آزاد کر دیا۔ اس سب میں چودہ دن لگے۔ غالباً جیٹھ یا بیساکھ کی
پہلی کو ستیہ وان مرا تھا اور چودھویں کو اپنی ساوتری کی کوششوں سے زندہ
ہو گیا تھا۔ چنانچہ گجرات کی طرف اس مہینے کی پہلی سے پونما تک اب بھی عورتیں
برگد کی پوجا کرتی ہیں اور لڑکے کی مرادیں مانگتی ہیں۔

پیپل کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اس کی جڑ سے لے کر پھنگی تک
ہر چیز مقدس ہے، اور اس کی ایک ایک پتی میں ایک ایک دیوتا رہتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب پیپل اپنی انتہائی نمو کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں تینتیس کروڑ
پتیاں ہوتی ہیں اور اتنے ہی ہندوؤں میں دیوتا مانے گئے ہیں۔ چنانچہ پیپل
کو کاٹنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ شارحین کا کہنا ہے کہ پیپل ہر قسم کی چڑیوں
کا محبوب ترین نشیمن ہے اور ہوا کو صاف کرنے میں بھی تمام درختوں سے زیادہ
کام کرتا ہے۔

تلسی کو سوسرت اور چرک کے زمانے سے جو شہرت حاصل ہوئی وہ آج تک قائم ہے۔ چرک علم الجراحت میں
مشہور تھے اور سوسرت علم المعالجہ میں۔ سوسرت کی تصنیفات کے مطابق تلسی
نہ جانے کتنے امراض کی دوا ہے اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ بتائی گئی ہے
کہ یہ ہر قسم کے متعدی جراثیم کو فنا کر دیتی ہے۔ چنانچہ دواؤں میں استعمال ہونے
کے علاوہ آج تک یہ رواج چلا آ رہا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُسے سب سے
پہلے جو پانی پلاتے ہیں اس میں تلسی کی پتی ضرور ڈالتے ہیں۔ اور جب کوئی
مرنے لگتا ہے اس وقت بھی اُس کے حلق میں تلسی ہی کا پانی ٹپکاتے ہیں۔

کدمب اور کدمب کنج کا نام ہر اس شخص نے سنا ہو گا جو رادھا اور کرشن کے عشق
حقیقی کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ "سر پر کدمب کی چھیاں مرلیا باجے"
کا بھجن آج تک مشہور ہے۔

یہ گنجان اور چھتدار درخت شاید پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ اس کی
ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کرشن جی پریم اور پریت کی بنسی بجائیں اور ان کی
گوپیاں اٹکھیلیاں کریں۔ جب کرشن جی بندرابن چلے گئے اور رادھا کی دُنیا
ہمیشہ کے لیے تاریک ہو گئی تو اُن کا واحد مشغلہ کدمب کی سیوا رہ گیا تھا جس کی

چھاؤں میں انھیں کرشن جی مرلی بجاتے نظر آتے تھے۔

اسی طرح اشوک کا درخت سیتا اور رام کی محبت سے وابستہ ہے۔ جب راون سیتا جی کو اُٹھا لے گیا تو اُس نے انھیں اشوک ہی کے جنگل میں نظر بند کیا تھا۔ وہ سارا زمانہ جس میں سیتا کو دوہری اذیتیں اٹھانا پڑیں ایک رام کے انتظار بے حساب کی اذیت دوسرے راون کے پے در پے اصرار کی اذیت وہ اشوک ہی کے بن میں کٹا۔

مہوے اور آم کے درختوں کو بھی سیتا اور رام کی خدمت کی سعادت حاصل ہے۔ وہ اس طرح کہ جس پنچ کٹی میں سیتا اور رام بن باس کے زمانے میں رہا کرتے تھے اس میں ایک ایک درخت مہوے اور آم کا بھی تھا۔

نیم کی افادیت تو اتنی ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ خون کی صفائی کے لیے نیم کی کونپل پینے اور پھوڑے پھنسی میں نیم کی پتیاں باندھنے کا رواج آج تک چلا آرہا ہے۔ اسی طرح "نوا تلے ڈولا رکھ دے مسافر آئی ساون کی بہار رے" شمالی ہند کا ایک مقبول عام ساون ہے۔

مختصر یہ کہ ماضی کے جتنے ورق اُلٹے جائیں ہندوستان کے مذہب، آرٹ اور ادب میں درختوں کی اُتنی ہی اہمیت واضح ہوتی جائے گی یہاں تک کہ جب کچھ نہیں تھا صرف پانی ہی پانی تھا، اس وقت بھی بھگوان ایک پتی ہی کی کشتی پر سوار عالم آب میں تیرتے پھرتے تھے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا کی کھدائی میں جو آریوں سے بھی پہلے کی ہندوستانی تہذیب کے نمونے ملے ہیں ان سے ان کی قدامت اور عظمت کا تو پتہ چلتا ہی ہے، مگر ساتھ ہی

ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی مصوری اور نقش نگاری میں پتیوں اور درختوں کو کتنی مقبولیت حاصل تھی۔ ایک ایسا نقش ملا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ شیر بھوک سے زمین کرید رہا ہے اور انسان اطمینان کے ساتھ درخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ کالی داس نے اپنی مشہور عالم تصنیف "شکنتلا" میں ہندوستان کے درختوں اور پتوں کو حیات جاوید عطا کر دی ہے۔ شاعر اعظم ٹیگور کا کہنا ہے کہ شکنتلا سے بن نکال دیے جائیں تو اس کا حسن آدھا رہ جائے گا۔ قدیم ہندوستان میں جتنے شبھ کام ہوا کرتے تھے مثلاً لڑائی کے بعد صلح وہ سب درختوں کے نیچے انجام دیے جاتے تھے۔ آج بھی شادی کے گھرانے میں دروازے کی پیشانی پر ہری پتیوں کی ایک لڑی لٹکا دی جاتی ہے، اور شادی کی رسم درخت ہی کے نیچے ادا کی جاتی ہے خواہ وہ مصنوعی درخت کیوں نہ ہو۔

جب مسلمان آئے تو وہ بھی اپنے ساتھ درختوں کا ایک حسین تصور لے کر آئے۔ بظاہر وہ گلّہ بانی تہذیب جو مسلمانوں کے ساتھ یہاں آئی ہندوستان کی زراعتی تہذیب سے بہت مختلف تھی مگر بنیادی شعور دونوں کا ایک تھا۔ یعنی قدرت کے گیت گانا۔ گیارھویں صدی میں یہ یکسانیت اور گہری ہو گئی تھی۔ چنگیز خاں کی غارت گری نے مسلمانوں کے زعم شجاعت پر ایسی ضرب کاری لگائی تھی کہ وہ اللہ اللہ کرنے لگے تھے۔ عام قاعدہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو انسان خدا کو یاد کرتا ہے۔ چنانچہ مسلمان بھی یاد اللہ میں ڈوب گئے، اور شجاعت و بہادری کی جگہ تصوف کے گیت گانے لگے۔ ہندوستان میں یہ ساز پہلے ہی سے چھڑا ہوا تھا اس لیے یہاں کی

جنگلی اور وہاں کے تصرّف میں کوئی تصادم نہیں ہوا بلکہ امیر خسرو جیسے شاعر اور
حضرت نظام الدین جیسے اولیا پیدا ہوئے۔ اس امتزاج نے ملکی اور نو وارد
تہذیب پر کیا اثر ڈالا یہ ایک طویل داستان ہے اور یہاں اس کا بیان بے محل
بھی ہوگا۔ اس لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ مسلمانوں کی لائی ہوئی تہذیب میں سبزہ
و گیاہ کو بڑا دخل حاصل تھا۔ انھیں درختوں سے عقیدت تو نہ تھی مگر محبت بہت
تھی۔ انکی روایات میں نہ حضرت آدم شجرِ ممنوع کے قریب جاتے نہ یہ لغزش
انسان کو عالمِ وجود میں لانے کا بہانہ بنتی۔ مگر فارسی شاعری میں جو اس وقت
مسلمانوں کا ایک بڑا سرمایۂ تہذیب تھی مجرد درختوں کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ کمی سب
سے پہلے امیر خسرو نے پوری کی۔ جنھوں نے ہندوستان کے بے شمار درختوں اور
پہاڑوں کی تعریف کی ہے۔ ان کا رومان درختوں سے "سرو قد" اور "طوبیٰ
قامت" کی حد تک وابستہ — بن اور جنگل کی جگہ فارسی میں باغ اور چمن
رادھا اور کرشن کا سارا رومان فارسی ادب کو نہیں میسر تھا۔ اس لیے
فارسی شاعری میں درختوں کا ذکر اسی حد تک محدود رہا جہاں تک وہ معرفت
کردگار کا وسیلہ بن سکتے تھے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اردو شاعری ہیں کی گھنی چھاؤں میں ایک خوش نما بیل کی طرح نکلی اور چڑھتی
چلی گئی اس لیے اس میں درختوں کا ذکر مقابلتاً زیادہ ہے اور براہِ راست ہے

سفر ہو شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم بادوباراں ہے
چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے! کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

غرض چمن و بہار کے تذکروں اور شاخِ بارآور کے نصیحت آموز حوالوں سے
اردو شاعری بھری پڑی ہے۔

پٹھانوں میں شیر شاہ کو درختوں کے سلسلے میں اشوک کی سی اہمیت
حاصل ہے۔ مغلوں میں تو شاید ہی کوئی ایسا بادشاہ گزرا ہو جس نے کہیں نہ کہیں
باغ نہ لگائے ہوں۔ پرانے امرا کی ہر حویلی کے ساتھ ایک پائیں باغ کا
ہونا قریب قریب ضروری تھا۔ یہ محض شانِ امارت نہیں تھی بلکہ پردے کے
رواج کو دیکھتے ہوئے اس وقت ایک اچھی خاصی ضرورت بھی تھی۔

عوام جو ہمیشہ سے مشترکہ تہذیب کے حامل ہیں ان تمام روایات کو سنبھالے
رہے جو انھیں ترکے یا ورثے میں ملی تھیں۔ آج بھی ہرے بھرے درخت کو
کاٹنا یا شام کے بعد اسے چھیڑنا مسلمان گھرانوں میں بھی اتنا ہی برا سمجھا جاتا ہے
جتنا ہندو گھرانوں میں۔ ظاہر ہے کہ یہ اس عظمت و تقدس کا اثر ہے جو ہندو
تہذیب میں درختوں کو صدیوں سے حاصل ہے۔ چنانچہ خانقاہوں اور درگاہوں
پر نظر دوڑائیے 'جن کی ساری رونق عوام کے دم سے ہے' تو قریب قریب ہر
خانقاہ میں ایک نہ ایک املی یا نیم کا درخت ایسا ضرور ملے گا جس کے بارے

یں عجیب عجیب روایتیں مشہور ہیں۔ کسی درخت پر جن رہتے ہیں تو کسی پر بھتنیاں
اتاری جاتی ہیں۔ یہ توہمات کتنے ہی غلط سہی، اور ان کا جلد از جلد دور ہونا
کتنا ضروری ہی سہی، مگر ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات
کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ درختوں کو ہندو اور مسلمانوں دونوں کے ذہنوں میں
ان کی افادیت کے علاوہ بھی ایک دلچسپ حیثیت حاصل ہے۔

اگر ہندو کے حلق میں مرتے وقت تلسی کا پانی ٹپکانا ایک شُبھ کام ہے تو
مسلمانوں کی قبر پر کھجور کی ہری شاخ گاڑی کرنا ایک مستحسن فعل ہے۔ اگر ہندوؤں
کا خیال ہے کہ تلسی کی پتی ایک مرنے والے کو پاک و صاف کر دیتی ہے تو مسلمانوں
کا خیال ہے کہ جب تک کھجور کی ٹہنی ہری رہتی ہے وہ درود پڑھا کرتی ہے اور
صاحبِ قبر کو ثواب بخشتی رہتی ہے۔

(آجکل سنہ ۱۹۵۰ء)

مرقع شعراء کا تعارف

مرقع شعراء رام بابو سکسینہ کی ایک گرانقدر تالیف ہے جسے مولانا آزاد کے
گراں مایہ پیش لفظ نے اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس میں رائے جیونت سنگھ پروانہ
لکھنوی، رائے ٹیکا رام تسلی لکھنوی، کرپا دیال سکسینہ مشتطر لکھنوی، دلوالی سنگھ
قتیل فرید آبادی، مکند لال فدوی لاہوری کی تصویروں کے علاوہ حسرت دہلوی
ضیا دہلوی، مرزا مظہر جان جاناں، مصحفی اور میر تقی میر کی رنگین و دلآویز تصویریں
شامل ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:-

"اگر ان اوراق میں کچھ اور نہ ہوتا صرف میر تقی میر اور
حضرت مرزا مظہر کی تصویریں ہوتیں، جب بھی ان کی غیر معمولی قدر و
قیمت کا اعتراف کرنا پڑتا۔ کیونکہ اردو شاعری سے رسم و راہ
رکھنے والا کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو میر صاحب یا مرزا صاحب

کی زیارت کا خواہش مند نہ ہو۔"

لیکن میر اور مظہر کے علاوہ مصحفی، قتیل، انشا، جرأت، حسرت دہلوی کی تصویریں بھی اردو ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے کافی دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

لکھنؤ اسکول کے شیدائیوں کو یہ مرقع دیکھ کر ایک خاص خوشی یوں بھی ہوگی کہ اس میں لکھنوی تہذیب کا اثر بہت نمایاں ہے۔ بھولا ناتھ کا کنواں آج تک لکھنؤ کا ایک مشہور محلہ ہے۔ کون ہے جسے بھولا ناتھ کے بھتیجے راجے ٹیکا رام تسلی کی حسین و جمیل تصویر دیکھ کر یہ نہ یاد آئے کہ یہ ٹیکا رام شاہی اودھ کے وہی محبوب و معزز عہدہ دار ہیں جن کے مشاعروں میں نواب آصف الدولہ خود شرکت کیا کرتے تھے۔ جسونت سنگھ پروانہ کی تصویر بھی اُن حسینانِ لکھنؤ کی یاد دلاتی ہے جن کے نام سے شامِ اودھ آج تک مشہور ہے۔

اس مرقع میں دلوالی سنگھ قتیل فرید آبادی کی غالب سے ہمسری، اور مکند لال فرقی لاہوری کی مرزا سودا سے نوک جھونک کا بھی ذکر ہے، یعنی مرقع شعرا سے علم و ادب کے اک ایسے دور پر روشنی پڑتی ہے جس کی تاریخی حقیقت اس قسم کے تذکروں ہی میں محفوظ رہ سکتی ہے۔

لیکن پہلی نظر میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے اس میں میر و مظہر کی تصویروں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دو تین ہستیوں کے علاوہ باقی جن حضرات کی تصویریں ہیں ان کے نام و کلام سے آج بہت کم لوگ واقف ہیں دوسرے دہلی اور لکھنؤ کے معروف و غیر معروف شعرا کا ایسا خلط ملط ہو گیا ہو

کہ مرقع کی ترتیب کا مقصد ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ جو بھی اس مرقع کی ورق گردانی کرتا ہے، وہ سوچنے لگتا ہے کہ آخر یہ کون سا مرقع ہے جس میں پروانہ لکھنوی سے خوش اوقات و شریر حرکات شاعروں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ حضرت مظہر اور میر تقی میر کی سی مجمع الصفات ہستیاں یکجا کر دی گئی ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ اس کی ترتیب پر فاضل مؤلف رام بابو سکسینہ کو کوئی اختیار ہی نہیں تھا۔ شاہی زمانے کے نگار خانوں کی طرز پر جن کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ان میں شعرا کی تصویریں بھی ہوتی تھیں، مختصر سے حالات بھی ہوتے تھے اور کچھ انتخاب کلام بھی ہوتا تھا کسی صاحب نے جن کے بارے میں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ کائستھ تھے ایک نگار خانہ اپنی پسند سے بنایا تھا جس کے چند اوراق اُردو کے مشہور مورخ رام بابو سکسینہ کو مل گئے۔ انھوں نے "قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری" کی مثل پوری کرتے ہوئے ان خستہ و بوسیدہ اوراق کو کلیجے سے لگا لیا اور مولانا آزاد سے بصیر و محقق سے مشورہ کے بعد ان کو اس حوصلہ، سلیقہ اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے کہ ایک ورق پر سہ رنگے بلاک میں شاعر کی تصویر دی ہے۔ دوسرے ورق کے پہلے صفحہ پر اصل مسودہ کا عکس دیا ہے اور پشت پر پڑھنے والوں کی آسانی کے خیال سے عبارت کی صحت و کتابت کرا کر اسے دوبارہ بلاک کی صورت میں چھاپ دیا ہے۔ اس طرح ساری کتاب علاوہ پیش لفظ بیس اوراق پر مشتمل ہے اور سب بلاک ہی بلاک ہیں۔ دس میں شعرا کی رنگین تصویروں کے بلاک ہیں اور دس میں ان کے حالات اور انتخاب کلام کے بلاک۔

انتخاب میں جو عام خرابی ہوتی ہے وہ اس میں بھی ہے۔ یعنی صاحب نگار خانہ

نے جو شعر دیے ہیں وہ ان کی اپنی پسند کا نمونہ زیادہ ہیں اور کلام شاعر کا نمونہ کم ہیں۔

سب سے اہم چیز جیسا کہ مولانا آزاد نے فرمایا ہے میر اور مظہر کی تصویریں ہیں۔ حضرت مظہر کی تصویر یقیناً صحیح تصویر ہے۔ اول اس لئے کہ وہ دیکھنے ہی میں ایک پیر تق پرست کی شبیہ معلوم ہوتی ہے، دوسرے اس لئے کہ مولانا آزاد نے اس پر صاد فرمایا ہے لیکن میر کی تصویر کو دیکھ کر کچھ اچنبھا سا ہوتا ہے۔ اگر تصویر کے نیچے میر تقی میر نہ لکھا ہو تو اس میں میر کا شائبہ بھی نہیں نظر آتا۔

ایک بانکا ترچھا جوان کمر میں کٹار باندھے، مسند کی ٹیک لگائے پیچوان پر ہاتھ رکھے اس ٹھاٹ سے بیٹھا ہوا ہے جیسے اس پروردۂ عشرت نے کبھی آلام روزگار کا نام بھی نہیں سنا۔ لکھنؤ کی دو پلی ٹوپی اور کلی دار انگرکھا اس کے گٹھے ہوئے جسم پر ایسا کھل رہا ہے جیسے یہ لباس اسی کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ یہ جوان جس کی داڑھی چڑھی ہوئی ہے، مونچھیں تنی ہوئی ہیں۔ بالوں میں سفیدی کی جھلک بھی نہیں ہے۔ چاروں طرف فراغت ہی فراغت برس رہی ہے وہ میر تو شاید ہی ہو جو ساٹھ سال کے سن میں سنہ ۱۱۹۶ھ مطابق سنہ ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ آئے تھے اور زاد راہ میں کچھ لائے تھے تو غم و یاس و ناکامیاں ہی لائے تھے۔

مانا کہ دہلی میں ایک روپیہ روز وظیفہ پانے والے میر کو جب لکھنؤ میں آصف الدولہ کے دربار سے تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ ملا ہوگا تو ان کی وہ وضع قطع ضرور بدل گئی ہوگی جسے دیکھ کر پورب کے ساکن انھیں ہنس ہنس پکارتے تھے مگر چار دن کے عیش میں ساٹھ سال کی اذیتیں ایسی کافور ہوئیں کہ ایک جھائیں بھی چہرہ پر نہ رہ گئی یہ ذرا مشکل سے یقین آتا ہے۔

گمان یہ ہوتا ہے کہ مصور نے میر کی ۲۰ سال کی عمر سے جوانی دہلی کے زمانے کی لے لی، خوش حالی لکھنؤ کے زمانہ کی لے لی اور دونوں کو یکجا کر کے ایک تصویر بنا دی جس میں رنگ درج لکھنؤ کی ہے اور سن و سال دہلی کا ہے۔

مصور نے میر صاحب کے مکان کا جو نقشہ بنایا ہے اس میں ایک اچھی سی بیٹھک بھی ہے اور وہاں باغ بھی ہے۔ خود میر صاحب نے اپنی مثنوی خانۂ میر میں اپنے گھر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ یہ ہے۔

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال ۔۔۔ اس خرابی میں میں ہوا پامال
چار دیواری سو جگہ سے خم ۔۔۔ تر تو رہا ہو تو سوکھتے ہیں ہم
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے مٹی ۔۔۔ آہ! کیا عمر بے مزہ کاٹی
ایک حجرہ جو سب سے ہے اچھا ۔۔۔ سنیے اب اس کا حال مجھ سے ذرا
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک ۔۔۔ کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیری ہو خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے ۔۔۔ کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا ۔۔۔ شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے ۔۔۔ کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کڑی تختے سب ہی دھوئیں سے سیاہ ۔۔۔ اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھی کوئی پھو لیا ہے پھرے ۔۔۔ کبھی چھت سے ہزار پا گرے
کڑی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے ۔۔۔ کوئی ڈاسا کہیں سے چھوٹا ہو

دب کے مرنا ہمیشہ مد نظر
گھر کہاں؟ وہ صاف موت کا ہے گھر

ظاہر ہے کہ میر اور رخسانہ میر کی جو تصویر ان کے اشعار سے ذہن میں آتی ہو
وہ اس تصویر سے مختلف ہو جو مصور نے بنائی ہے۔

اس موقع پر میر کے چند شعر بے اختیار قلم سے نکلے جا رہے ہیں۔

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت جاگے تھے صبح ہوئی آرام کیا

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر مذہب عشق اختیار کیا

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

حالت تو یہ کہ مجکو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزش درونی سے جلتا ہو جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردہ سے انسان نکلتے ہیں

اب تو دنیا و جہاں کا مذکور ہی نہیں
تم کس سمے کی کہتی ہو یہ ہو کہاں کی بات

صاحب نگارخانہ نے بھی میر کے چند شعر اپنی یاد سے درج کیے ہیں مگر ان سے سیری نہیں ہوتی۔

جی چاہتا ہے کہ میر کی نازک خیالی، نازک مزاجی، سلاست، حلاوت سوز و گداز اور فقر و قناعت کا کم سے کم ایک ہی ایک شعر اس انتخاب میں ہوتا۔ جس کی تالیف میں رام بابو سکسینہ اور صحت میں مسعود حسن رضوی کی سی ہستیاں شریک ہوں اس میں میر کیا ہر شاعر کا نمایندہ کلام ضمیمہ کے طور پر شامل کیا جا سکتا تھا جس سے مرقع شعرا کی افادیت کہیں بڑھ جاتی۔

لیکن ان حضرات نے اسکے تاریخی ہی پہلو پر نظر رکھی اور نگارخانہ کے اوراق کو من و عن و بلا کم و کاست چھاپ دیا۔ اگر دوسرے ایڈیشن میں مسودہ کا عکس دینے کے ساتھ ساتھ شعرا کے حالات و انتخابات میں کچھ اضافے کر دیے جائیں تو مرقع شعرا اس دور کی ایک غیر معمولی کتاب شمار کی جائے گی۔

ویسے بھی اردو ادب کی کوئی لائبریری اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ کتاب کیا ہے ایک مرقع زیور ہے جسے دیکھ کر جی سب کا جی للچاتا ہے مگر خریدنے کی ہمت کم ہی کو ہوتی ہے۔

نیا دور ۱۹۵۷ء

بیکراں پر ایک نظر

تیری نئی فضا میں مرے اے نئے وطن
ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں (جگن ناتھ آزاد)

جگن ناتھ آزاد کسی کو اپنا بنا سکے ہوں یا نہیں مگر نئے وطن نے ضرور اُن کو اپنا بنا لیا ہے۔ صرف چند برسوں میں ان کو وہ شہرت و مقبولیت حاصل ہو گئی ہو جو دوسروں کو بیس سال سے کم کی ریاضت پر نہیں نصیب ہوئی۔ شعر و سخن کی شاید ہی کوئی محفل ہو جس میں جگن ناتھ آزاد کے چرچے نہ ہوتے ہوں۔ علم و ادب کا شاید ہی کوئی رسالہ ہو جس میں جگن ناتھ آزاد کی نظمیں امتیازی شان سے نہ شائع ہوتی ہوں۔ ان کے مجموعہ کلام بیکراں کا پہلا ایڈیشن جو نومبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا ایک سال سے بھی کم عرصے میں ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے اس لیے کہ آجکل کے سخن فہم غالب کا دیوان بھی مشکل سے خرید کر

پڑھتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کا مجموعہ تو چند برسوں میں تین بار نکل چکا ہے۔

بیکراں کے تازہ ترین ایڈیشن میں وہ نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں جو پہلے ایڈیشن کی ترتیب میں "سیاسی خلفشار اور ذہنی انتشار" کی بدولت رہ گئی تھیں۔ یہ ایڈیشن ۲۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں فراق گورکھپوری کا وہ پیش لفظ بھی موجود ہے جو انھوں نے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت لکھا تھا۔

اچھا ہوا کہ کوئی نیا پیش لفظ نہیں شامل کیا گیا۔ اس لیے کہ اب جگن ناتھ آزاد کا نام کسی تعارف کا محتاج ہے نہ اُن کا کلام۔ یہ ایڈیشن سخن ہائے رنگا رنگ کا ایک ایسا جاذب نظر مرقع ہے جس میں رباعی، قطعات، غزلیں، نظمیں، (جن میں آزاد نظمیں بھی شامل ہیں) اور گیت، غرض ہر وہ صنف سخن موجود ہے جس پر دور حاضر میں طبع آزمائی کی جاتی ہے۔

موضوعات کے لحاظ سے بھی بیکراں واقعتاً بیکراں ہے۔ ایک طرف بیوی کی بیماری، کسولی کا سفر، بچوں کا استفسار کے سی خانگی حادثات پر ایسی المناک اور دردناک نظمیں ہیں جن کو پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے تو دوسری طرف آزاد ہند فوج کی تشکیل، سبھاش بوس کی بہادر شاہ کے مزار پر حاضری، ٹیپو کی وصیت، سکھدیو کی موت، نانک کا پیغام، آزادی کی تمنا، پھر آزادی کے جلو میں آنے والی بربادی کے سے قومی اور تاریخی موضوعات پر جوش اور ہوش سے بھری ہوئی ایسی جاندار نظمیں ہیں کہ نہ صرف پڑھنے والے کا خون گرما جاتا ہے بلکہ اُس کا شعور بھی جلا پا جاتا ہے۔

وطن پرور شاعری میں جوش اور ہوش کا امتزاج ضروری ہوا کرتا ہے

تاکہ انسان اپنے وطن کی محبت میں اتنا دیوانہ نہ ہو جائے کہ دوسرے کے وطن
کو ٹھوکر مار دے۔ یہ احتیاط نہ کی جائے تو وطن پرستی کا جوش ایک ہولناک
طوفان بن سکتا ہے، اور اپنوں کی محبت غیروں سے نفرت کا سبق دینے لگتی
ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی وطن پرستی شروع ہی اس بلندی سے ہوتی ہے جہاں
کی فضا میں نفرت و کدورت کے ذرات پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اپنے آبائی وطن
سے نکال دیے جانے کے بعد آزاد کے لہجے میں ذرا بھی تلخی نہیں آئی۔ کوئی
صرف گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوا تو غالب نے اتنی بڑی تعریف کر دی تھی

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

یہاں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی جگن ناتھ آزاد کی شیریں بیانی میں فرق نہیں آیا
ظاہر ہے کہ کس بلا کی شیریں بیانی تھی کہ اتنی تلخیوں کی آمیزش کے بعد بھی آج
اُن کا کلام اتنا شیریں ہے۔

وطن پرستی کے اس تصور کو ذہن نشین کرنے کے بعد ذرا متنوع موضوعات
پر پھر نظر ڈالیے تو بیکراں میں ایک نظم 'بورڈ آف انٹرویو' کے عنوان سے ملے
گی۔ جس سے ہر پڑھے لکھے کو سابقہ پڑتا رہتا ہے مگر ہر ایک میں یہ قدرت کہاں
کہ وہ اپنے تاثرات و محسوسات کو لفظوں کا جامہ بھی پہنا سکے۔ جگن ناتھ آزاد نے اس لاچاری
پر ترس کھا کر تمام بے زبان پڑھے لکھوں کی ترجمانی کر دی ہے۔ ایک اور نظم شاعر
سے خطاب کے عنوان سے ملے گی جس میں جگن ناتھ آزاد نے شعر و سخن کی دشوار گزار
اور پرخطر وادیوں سے آج کے شاعر کو ہوشیار کرتے ہوئے۔ کچھ آسان راستے بتلائے

ہیں، اور بڑی شفقت سے نصیحتیں کی ہیں کہتے ہیں ۔

اور اگر کہنا ہو کچھ اپنے وطن کی شان میں
راز کی اک بات کہتا ہوں میں تیرے کان میں
یہ نہ کچھ انگریز ہو باطن کا ہے سارا قصور
بلکہ ہندو ہے تو کچھ یہ ہے مسلماں کا قصور
اور سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو مسلم اگر
تو مناسب ہے کہ سب الزام دے ہندو کے سر
دیکھ اپنے آپ کو شہری نہ دنیا کا سمجھ
قوم کی زنجیر میں جکڑا ہوا بندہ سمجھ
اس سے تیرا قوم میں اونچا نشاں ہو جائے گا
کامران فن ہو نہ ہو تو کامراں ہو جائے گا

نصیحتیں ایسی نہ تھیں کہ صرف شاعر کے کان میں پہنچنے سے پھونک دی جاتیں
مگر جگن ناتھ آزاد صرف شاعر ہی کو کامران دیکھنا چاہتے ہیں۔ آخر شاعر ہیں
اس لیے انھوں نے اپنے مشورے اپنوں ہی تک محدود رکھے۔ اگر اس موقع پر
اور لوگ جگن ناتھ آزاد سے شکایت کریں اور اُن پر فنکارانہ جانبداری
کا الزام رکھیں تو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔

بہر حال یہ دونوں نظمیں بہترین طنز ہیں۔ خود اپنی شاعری کے لیے
جگن ناتھ آزاد نے جو معیار مقرر کیا ہے وہ یہ ہے:—

بہبود بشر کے یہ اگر کام نہ آئی　　کس کام کی اے ذوقِ سخن تیری جگالی

جس نظم میں ہو جوشِ نوا کی تڑپ بھی — وہ نغمۂ آزاد فقط مرثیہ خوانی

اور لطف یہ ہے کہ یہ دونوں غزل کے شعر ہیں یعنی جگن ناتھ آزاد نے غزل کے لیے بھی یہی اصول مقرر کیے ہیں۔ عام طور پر غزل گو شاعر یا غزل پسند قارئین ان اصولوں سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں یہ دوسری بات ہے لیکن خود آزاد کی غزلیں اس معیار پر ضرور پوری اُترتی ہیں۔ ایک اور غزل میں کہتے ہیں:

بشر کو بھی کبھی تو موردِ الزام ٹھہرا دے
فریبِ رنگ و بو کھائے گا آخر کارواں کب تک

اسیرانِ رسم و رہ سے تم آزاد یہ کہہ دو
یہ رنگ و نور و نکہت کا ہجوم بیکراں کب تک

اگر پہلے سے معلوم نہ ہو تو ہر شخص ان کو نظم ہی کے شعر کہے گا۔ بات یہ ہے کہ پہلے وہ اقبال سے متاثر ہوئے پھر جوش سے وابستہ رہا۔ اس لیے اُن کے رنگ آہنگ میں نظم کی جھلک زیادہ آتی ہے، اور جس دور کا یہ مجموعہ ہے اس میں غزل سرائی کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس سب کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جگن ناتھ آزاد صرف نظم گو شاعر ہیں۔ مانا کہ بیکراں میں ایسی غزلیں مشکل ہی سے ملیں گی۔ جو سخن گفتن بہ معشوق کی روایت کو تازہ کرتی ہوں۔ پھر بھی وہ حسنِ بیان اور حسنِ ادا ہر صنفِ سخن میں نظر آئے گا جو غزل کی جان ہے۔

اس لیے یہ توقع غلط نہ ہوگی کہ مستقبل میں نظم اور غزل دونوں ہی جگن ناتھ آزاد کے ہاتھوں پروان چڑھیں گی۔

بیکراں کے آخر میں ضمیمے کے طور پر ایک عظیم الشان نظم "اردو" کے عنوان

سے ہے جس میں جگن ناتھ آزاد نے اُردو کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ نظم کیا ہے ایک فریاد ہے جس سے دل تو پگھل جاتا ہے مگر آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں۔ قدیم زمانے سے اس جدید دور تک اُردو کا ایک ایک محسن سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ کس کس حقیقت سے انکار کرو گے۔

اس نظم سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو ادب پر جگن ناتھ آزاد کی نظر کتنی گہری ہے۔ باوجودیکہ یہ نظم لاہور میں لکھی گئی ہے مگر اُن کی آنکھوں کے سامنے پورا لکھنؤ سے شاعر بھی موجود ہے، حالاں کہ اُن کی شہرت، دور تک نہیں پہنچ پائی تھی

بیکراں کی اس جامعیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ اس کے یہ نسخے بھی ہاتھوں ہاتھ نکل جائیں گے اور جگن ناتھ آزاد کو چوتھے ایڈیشن کی فکر جلد ہی کرنا پڑے گی۔

نیا دور لکھنؤ ویشاکھ سموت ۲۰۰۹ — اشک

شاہِ معزول

واجد علی شاہ اودھ کے آخری تاجدار ۱۸۴۷ء میں اپنے والد امجد علی شاہ
ی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے اور ۱۸۵۶ء میں کمپنی بہادر کے حکم سے معزول
ردیئے گئے۔ اس کے بعد ساری عمر انھوں نے مٹیا برج کلکتے میں ایک وظیفہ خوار
ی حیثیت سے بسر کی اور وہیں مرنے کے بعد دفن ہوئے۔

انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخیں پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کا یہ آخری
ادشاہ بہت ہی بدکار اور بداطوار انسان تھا جسے کمپنی نے معزول کرکے رعایا پر
ڑا احسان کیا۔ لیکن کچھ انگریز مورخین ایسے بھی ہیں جو خدا لگتی کہہ گئے ہیں۔ مثلاً مٹکاف
ے اپنی کتاب *Two Native Narrative of Mutiny in Delhi*
یں لکھا ہے کہ واجد علی شاہ خود اپنی فوج کو قواعد کراتے تھے اور اُنھوں نے پابندی
وقات کے لیے یہ اصول نافذ کر رکھا تھا کہ جو بھی فوجی افسر دیر میں آئے وہ دو ہزار

روپے جرمانہ دے۔ اس سزا سے واجد علی شاہ خود بھی مستثنیٰ نہیں تھے۔ سوائے اس
کے کہ اُمورِ سلطنت ہی کے باعث ہی انھیں دیر ہو جائے۔

فنِ قواعد پر مجاہدۂ اختری کے نام سے واجد علی شاہ کا ایک رسالہ بھی موجو
ہے جس کی تاریخ حسبِ ذیل ہے:—

یہ وہ رسالۂ شہِ انجم سپاہ ہے — جس سے ہے پلٹنوں کی قواعد کا انتظام
لے کر تو حضور میں حضرت کے عرض کر — تاریخ کا مجاہدۂ اختری ہے نام

اس رسالے اور اس تاریخ کی موجودگی کے بعد واجد علی شاہ پر یہ الزام تو بہر حال نہیں
لگ سکتا کہ وہ اُمورِ سلطنت سے کوئی دلچسپی ہی نہیں لیتے تھے اور ناچ رنگ میں
ڈوبے رہتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُمورِ سلطنت میں سب سے اہم مسئلہ بادشاہ
کے سامنے یہی رہ گیا تھا کہ تخت و تاج کیسے سلامت رہیں۔ واجد علی شاہ کو پہلے
ہی دن سے یہ احساس تھا کہ وہ تختِ شاہی پر نہیں بیٹھ رہے ہیں، بلکہ ایک ڈوبتی
کشتی پر سوار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اپنی تخت نشینی کے سلسلے میں واجد علی شاہ بیت
حیدری میں لکھتے ہیں:—

مقرر جو تھا وقت وہ آ گیا — پکڑ کر سرِ تخت پہنچا گیا
خدا نے مرے سر پہ رکھا یہ بار — مگر دیکھیے اس کا انجام کار

اب رہا یہ سوال کہ رعایا اُن سے مطمئن تھی یا غیر مطمئن، تو اس کا
سب سے قاطع جواب وہ واقعات ہیں جو واجد علی شاہ کی معزولی کے وقت سے لے کر
اُن کے کلکتے پہنچنے تک پیش آئے ہیں۔ جیسے ہی یہ خبر پھیلی کہ واجد علی شاہ لکھنؤ کو
خیر باد کہہ رہے ہیں اور آج ہی رات (۱۲ مارچ ۱۸۵۶ء) کو روانہ ہو جائیں گے

تو لکھنؤ کی ساری خلقت قیصر باغ پر ٹوٹ پڑی۔ ایک نکما اور ناکارہ بادشاہ ہوتا
تو خلقت کے اس اژدحام سے دہل اُٹھتا اور سب سے منھ چھپا کر چپکے سے
بھاگ نکلتا۔

مگر جب واجد علی شاہ کو یہ خبر ملی تو اُنھوں نے قیصر باغ کے شمالی دروازے
سے نکلنے کے بجائے (شمال و جنوب کے دروازے قیصر باغ کی تاراجی میں ڈھ
گئے، اب صرف مشرق اور مغرب کے دو دروازے رہ گئے ہیں) مشرقی دروازے
سے برآمد ہونے کا فیصلہ کیا، جہاں پر عوام کا اتنا زبردست ہجوم اکٹھا تھا کہ اگر
تھالی پھینکی جاتی تو سر ہی سر چلی جاتی۔

بعض انگریزی مورخین نے بھی لکھا ہے کہ سارا مجمع زار و قطار رو رہا تھا
اور اپنے بادشاہ کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔

واجد علی شاہ نے ہر خاص و عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"میں نے تم لوگوں پر دس سال حکومت کی، اگر میری ذات
سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کرنا، میں اب جا رہا ہوں اور خدا
جانے تم لوگوں سے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو"

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس نکمے اور ناکارہ بادشاہ کی صورت دیکھتے ہی مجمع کی طرف
سے ایک پتھراؤ شروع ہو جاتا اور واجد علی شاہ وہیں ٹھنڈے ہو جاتے۔ مگر
ہوا یہ کہ ان کلمات کو سنتے ہی ایک کہرام مچ گیا۔ آخر واجد علی شاہ نے اپنا مشہور شعر

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

انتہائی تاسف کے ساتھ پڑھا اور سوار ہو گئے۔

ہزارہا آدمی اس معزول بادشاہ کو کانپور تک پہنچانے گئے، جن میں
چھوٹے طبقوں کے لوگ بھی کثرت سے شامل تھے چنانچہ جہاں واجد علی شاہ
کانپور میں ٹھہرے تھے یعنی مسٹر ہڈسن کی کوٹھی پر جن کو واجد علی شاہ نے
ڈاک کا ٹھیکہ دے رکھا تھا وہاں ایک زبردست میلہ لگ گیا اور واجد علی شاہ
کو رہائش کی تکلیفوں کے باوجود کانپور میں پندرہ دن قیام کرنا پڑا۔

مثنوی حزنِ اختر کے مطابق واجد علی شاہ کو جو معزولی کا حکم ملا تھا اس
میں اُن پر صرف یہ الزام تھا کہ رعایا اُن سے ناخوش ہے۔ یہ الزام اتنا بے بنیاد
تھا اور اس کی صفائی اتنی آسان تھی کہ واجد علی شاہ نے اپنے وزیروں کے
اس مشورے کو بہتر سمجھا کہ اس کے خلاف ملکہ وکٹوریہ کے سامنے چارہ جوئی کی
جائے اور جہاں صرف تدبیر سے کام نکل سکتا ہے، وہاں زورِ شمشیر کیوں کھلایا
جائے۔ چنانچہ جدال و قتال سے گریز کیا گیا اور سلطنت چھوڑنے کے ارادے
کے ساتھ ہی ایک دستخطی مہم شروع کر دی گئی، جس کا سلسلہ کانپور تک جاری
رہا۔ لاکھوں آدمیوں نے لکھ کر دے دیا کہ ہم خوش ہیں اور ہمیں اپنے بادشاہ
سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

غرض کانپور سے چل کر واجد علی شاہ نے الہ آباد میں قیام کیا۔ یہاں انھیں
مہاراجہ ایشوری پرشاد والی بنارس کی یہ عرضداشت ملی کہ بنارس میں بادشاہ
اُن کے مہمان ہوں۔ کہتے ہیں کہ مہاراجہ بنارس واجد علی شاہ کے استقبال کے
لیے شہر کے ناکے تک آئے اور ان کی سواری کے ساتھ پیدل چلتے رہے۔ جب

بہت اصرار کیا گیا تو بادشاہ کی گاڑی سے دو تین گاڑیاں چھوڑ کر ایک گاڑی میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بنارس میں بھی ساری خلقت واجد علی شاہ کو دیکھنے کے لیے اُمنڈ آئی تھی، مگر وہ بند گاڑی میں بیٹھے رہے اور انھوں نے اپنی شکل نہیں دکھلائی۔ صفیرؔ نے لکھا ہے:—

ہزاروں تھے مشتاق دیدار شاہ　　تمنا میں آتے تھے شام و پگاہ
مگر بادشہ کو یہ منظور تھا　　کہ بعد حصولِ درِ مدعا
اسی راستے سے اگر آئیں گے　　تو جاہ و حشم سب کو دکھلائیں گے

نہ جانے واجد علی شاہ کو اپنی پیروی پر زیادہ بھروسہ تھا یا سرکارِ انگلشیہ کی عدل گستری پر زیادہ بھروسہ تھا کہ انھیں مدعا کے حصول کی اس وقت تک اُمید تھی۔ راجہ بنارس کی گراں قدر نذر واپس کرتے ہوئے بھی واجد علی شاہ نے جو الفاظ کہے اُن میں یہی اُمید جھلکتی تھی، انھوں نے کہا:—

"اپنا دل نہ میلا کرو اور اسے میری امانت سمجھ کر رکھے رہو۔"

مہاراجہ بنارس نے کہا:—

"تو خلعت بھی حضور میں اُسی وقت لوں گا۔"

اس سلسلے میں غور کرنے کی بات یہ نہیں ہے کہ واجد علی شاہ کس فریب میں مبتلا تھے بلکہ یہ ہے کہ معزول کر دیے جانے کے باوجود مہاراجہ بنارس سی مقتدر ہستی ان کے ساتھ کس محبت سے پیش آئی۔ لکھنؤ کی خلقت کی طرح بنارس کی خلقت بھی ان کے دیدار کے لیے کیسی بیتاب تھی۔

واجد علی شاہ بنارس کے راجہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ایک راجہ ملا وہاں وہ نیک　　لاکھ راجاؤں میں تھا راجہ ایک
ایسی خاطر ہماری کی اُس نے　　آتے ہی ہم کو نذر دی اُس نے
کشتیاں پیش کش جواہر خوب　　سب قرینے سے اور با اسلوب
خوب کچھ تھی بھی تجائی درست　　چاق ہم ہو گئے وہاں سب سست
پندرہ روز ہم رہے اُس جا　　ایک میلہ تھا اک تماشہ تھا

قلقؔ نے لکھا ہے کہ اُس سال مہاراجہ بنارس نے کوئی تہوار نہیں منایا۔ کہتے ہیں:—

واہ رے پاس جو کہتا تھا کوئی اہلکار
دیکھا اب کی برس آپ نے کوئی تہوار
تو وہ کہتا تھا کہ ہوں عیش میں ہم تو سرشار
اور اس طرح سے لُٹ جائے ہماری سرکار
شاد کیا خاک ہوں کس سے کہیں کس غم میں ہیں
اپنی سرکار کے مٹ جانے کے ماتم میں ہیں

یہ محبت و یگانگت جس کی مثالیں ۱۸۵۶ء کے واقعات میں قدم قدم پر ملتی ہیں، بعد کے دو تین سال کے انگریز راج میں ایسی کافور ہوئی کہ اس کا قیاس بھی مشکل ہو گیا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے انگریزوں کی ان چیرہ دستیوں پر عوام کا غم و غصہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ میرٹھ کی بغاوت سے تین دن پہلے، مئی ۱۸۵۷ء کو اودھ کی ہندوستانی فوج نے بغاوت کر دی اور چنہٹ کے معرکے میں انگریزوں

کو شکست بھی دے دی۔ مورخین کہتے ہیں کہ اگر اس فتح کے بعد ہندوستانی فوج دندناتی بڑھتی چلی آتی اور اسی دھاوے میں بیلی گارد تک پہنچ جاتی تو نہ جانے کیا نقشہ ہوتا۔ لیکن مزید سامانِ جنگ اکٹھا کیے اور مزید جتھوں کی فوجوں کو ساتھ لیے بغیر یہ کیسے ممکن تھا۔ اس لیے چنہٹ کے فاتح برکات احمد نے توقف کرنا ضروری سمجھا۔ افسوس ہے کہ اس اہم وقفے میں بعض غداروں نے انگریزوں کو وہ خط پہنچا دیے جو برکات احمد نے اپنے حلیفوں کو کمک اور یلغار کے لیے لکھے تھے۔

ہنری لارنس نے ان غداروں کو انعام دینے کے لیے ایک بڑا سا دربار منعقد کیا۔ جس میں اس نے تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہا کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں پر مظالم کیے۔ رنجیت سنگھ نے مسلمانوں پر مظالم کیے۔ نہ ایک کی سلطنت میں مندر بن سکتا تھا نہ دوسرے کی سلطنت میں مسجد بن سکتی تھی، ہمارے راج میں مندر و مسجد بلا روک ٹوک بن سکتے ہیں، ہم ہندو مسلمان سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کریں گے اس لیے آپ لوگ ہمارا ساتھ دیں۔

یہی نہیں ساتھ دینے والوں کے لیے بڑے بڑے انعامات اور بڑی بڑی معافیوں کا بھی اعلان کیا، پھر بھی ہندو مسلمان میں پھوٹ نہ پڑی۔ اور اودھ کے عوام نے واجد علی شاہ کے ایک کمسن لڑکے برجیس قدر کو اپنا بادشاہ بنا کر بیلی گارد کو سر کرنے کی مہم پورے زور شور کے ساتھ جاری رکھی۔ برجیس قدر کی حکومت میں ہندو مسلم برابر کے عہدے دار تھے مگر برکات احمد کو کوئی عہدہ نہیں دیا گیا، نہ مولوی احمد اللہ شاہ کے ساتھ دل کھول کر تعاون کیا گیا۔

شاید اس خوف سے کہ اقتدارِ اعلیٰ خاندانِ شاہی کے ہاتھ سے نکل کر عوام کے ہاتھوں میں نہ چلا جائے۔ مگر ان سب کے باوجود بیلی گارد کے محصورین کب کے ہتھیار ڈال دیتے اگر کنوجی لال اور انگد تیواری نام کے دو جاسوس لکھنؤ اور کانپور میں کامیابی کے ساتھ پیغام رسانی نہ کرتے رہتے۔ یہی دو ہستیاں تھیں جو بیلی گارد کے محصورین کی ڈھارس بندھاتے رہے اور انھیں انگریزی کمک کی امیدیں دلاتی رہیں۔ یہاں تک کہ نانا صاحب کو خلافِ توقع شکست دینے کے بعد انگریزی فوج ان کی رہنمائی میں دلکشا اور سکندر باغ ہوتے ہوئے بیلی گارد پہنچ گئی اور محاصرہ کرنے والوں کا قلع قمع ہو گیا۔

اودھ کی اس نبرد آزمائی سے واجد علی شاہ کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ انگریزوں نے اس کا سارا الزام انہی کے سر تھوپ دیا۔ اودھ کا وزیر باتدبیر علی نقی خاں تک گرفتار کر لیے گئے۔ واجد علی شاہ پر پہلے مٹیا برج میں سخت پہرہ لگا دیا گیا، پھر انھیں بھی فورٹ ولیم میں قید کر دیا گیا اور اودھ کی بادشاہت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

یوں تو شاہانِ جہاں پر ہے پڑا وقت مگر
ختم ہے اخترِ بے کس پہ جفائے غربت

لیکن فن کار کی حیثیت سے واجد علی شاہ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ شاعر بھی تھے، مغنّی بھی تھے، ماہرِ رقص بھی تھے۔ شاعر ایسے کہ انھوں نے چھ دیوان چھوڑے ہیں، مغنّی ایسے کہ نائک کے درجے کو پہنچے ہوئے تھے، ان کی تصنیف صوت المبارک نغمۂ ہندی پر ایک معیاری کتاب ہے اور ان کی ٹھمریاں جو

بے شمار ہیں آج تک گائی جاتی ہیں۔ واجد علی شاہ کی صرف ایک ہی نظم ہے جو انھوں نے راگ راگنیوں کے نظامِ اوقات پر کہی ہے اور مرزا ثریا قدر نے اپنی نادر تصنیف نغمۂ بہار میں شامل کی ہے۔ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں فنِ موسیقی میں کتنی غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ افسوس ہے کہ اس کے دو ایک مصرعے کاغذ کے ساتھ ناپید ہو گئے۔ وہ نظم حسبِ ذیل ہے:—

جو ہیں صبح کے راگ اے میری جاں
بتاتا ہوں ان کو سن اے مہرباں
کہ بھیروں ہے اور بھیرویں اور ببھاس
للت ہے الہیا ہے اے خوش قیاس
تلنگ اور ٹوڑی ہے اور جوگیا
تو پھر دیساکھ اور ککب با مزا
یہ دس نام بارہ بجے تک ہیں خوب
پھر آ گئے ہیں گانے میں ان کے عیوب
ہے گیارہ بجے سے بھی بارہ تلک
رخِ گوند سارنگ پہ اک چمک
سن اب اس کو جب شمس کا ہو زوال
تو گاتے ہیں ٹینگہ اے خجستہ خصال
عمل نٹ کا ہے دوپہر کو ضرور
حرارت کا ہے اس میں پائے وفور

ڈھلے دوپہر جب تو ہنڈول گا
سرِ شام رخ ہے سری راگ کا
اگر دوپہر کو خوشی سے ہے اٹھنی
تو گا اس میں سارنگ بندرابنی
جو بڑہنس کا تجھ کو آئے خیال
تو گا دوپہر کو اسے بے ملال
ڈھلے دوپہر جب تو اے خوش سیر
الاپ اس میں ملتانی تو بیش تر
کبھی پیلو جنگلا کبھی ماروا
کبھی غارہ اور لوم اے بامزا
کبھی جوگی کنٹر ہو وقتِ زوال
جو دھوئے ترے دل سے گردِ ملال
. . . . جو اے پرہنر
تو گوری کو گا لطف ہو بیش تر
. . . .
کبھی سہرٹ اور دیش اے بردبار
کبھی نٹ ملاری ہو برسات میں
بنے برق روشن سیہ رات میں
ہو سیندوری کا لطف برسات میں
مزا آئے ہر دم تری بات میں

جنجھوٹی[۳۱] کو ہر وقت گا اے ستمگر
تو شب مانجھ ایمن کے لے خوش سیر
پہاڑی[۳۲] جنجھوٹی بھی ہر وقت گا
بندھے جس میں گانے کا اچھا سماں
کلاوتی[۳۳] کو کہہ چاندنی میں اگر
سر شام گا کانہڑا[۳۶] اے ستمگر
دیا گا مری جان شدھ[۳۴] ایمن ہمیر[۳۵]
اگر عشق خوباں ہے دل میں خمیر
نمایاں ہو شہانہ[۳۷] کا وقت شب
گھڑی دو گھڑی رات کی گزرے جب
خیالوں میں گاتے ہیں اس راگ کو
نہ دُھرپدیوں نے اس کو برتا سنو
دنوں میں ہیں ہوری کی گائے بہار
نہیں یہ بھی کا راگ یہ زینہار
جو دل چاہے گا رات بھر مالکوس[۳۹]
مزا آئے گا ہو اگر مال کوس
تو کھماچ[۴۲] کو ساری شب گا اگر
تو ردیا ہی شب گزرے لے خوش سیر
ترینے سے گا بے پہ پرد بہاگ[۴۳]
کہ نیند آ جائے جیبوں کے بھاگ

پرج[۴۴] اور کا لنگڑا[۴۵] پچھلے کو گا
کہ تا صبح آئے ہر اک کو مزا
کبھی سوہنی گا۔ تو پچھلے کو یار
بتایا تجھے دل میں کر لے شمار

شاعری اُس زمانے میں زبان و بیان کا نام تھا، اور زبان کی لطافت و حلاوت واجد علی شاہ پر ختم تھی۔ اس لیے صحت لفظی جب بھی درکار ہوگی واجد علی شاہ کے کلام سے زیادہ مکمل اور مستند لغت نہیں مل سکے گا شاید ہی کوئی لفظ ہو اور شاید ہی کوئی محاورہ ہو جو انھوں نے نظم نہ کیا ہو۔ اور کیوں نہ ہو شاعری کا اُس زمانے میں مقصد ہی یہی تھا۔

واجد علی شاہ کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ دور جب غم و اندوہ کے جذبات سے اُن کے دل و دماغ نا آشنا تھے، اور وہ جانِ عالم تھے۔

دوسرا وہ دَور جب سیلاب نشاط فرو ہو گیا ہے اور غریب الوطنی میں مزاجِ شاہی پر ایک زبردست ردِّ عمل طاری ہے۔ بات بات پر لکھنؤ اور لکھنؤ کی رنگینیاں یاد آتی ہیں اور یہی غم و یاس کے جذبات شعر بن جاتے ہیں

غمگین ہوں ملول ہوں اب بل کہاں رہا
اب کیا کروں گا میں دل ناچار پر گھمنڈ

اس دَور کے بعض شعر پیش کیے جا چکے ہیں، اس لیے اب پہلے دَور کے کچھ شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ واجد علی شاہ نے اس کمسنی سے شعر

کہے ہیں، اس کثرت سے شعر کہے ہیں اور جو بات دل میں آئی ہے وہ اس بیباکی سے کہہ دی ہے کہ آج کے لحاظ سے اُن کے کلام کا ایک بڑا حصہ نذرِ آتش کر دینے کے لائق سمجھا جائے گا۔ مثلاً وہ تمام غزلیں جن کی ردیفیں اُنھوں نے بیگمات کے نام پر قائم کی تھیں۔ جیسے

دل ترے عشق میں بے تاب ہے تاباں بیگم
راحت و عیش و طرب خواب ہے تاباں بیگم

نمکیں، سانولی، طرار ہے منجھلی بیگم
خوش کرشمہ ہے مری یار ہے منجھلی بیگم

اور اس طرح کی دوسری غزلیں جن میں بڑی بیگم، ننھی بیگم، چھوٹی بیگم اور جاناں بیگم وغیرہ کو واجد علی شاہ نے اپنا ہدیۂ الفت پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد واجد علی شاہ کا جو کلام بچ رہے گا وہ کندن سے بھی زیادہ کھرا ہوگا۔ مثلاً واجد علی شاہ کی وہ غزل جو صنعت لزوم مالایلزم میں ہے۔ اس کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:—

لگایا داغ رخساروں کی ضو نے ماہِ تاباں کو
سُہا کو، بدر کو، ناہید کو، مہرِ درخشاں کو

کیا سرسبز و شاداب عکسِ رُخِ رنگیں نے
گلوں کو، پھول کو، پتوں کو، شاخوں کو، گلستاں کو

رسائی نے کمندِ زلف کی کیا کیا بڑھایا ہے
ستم کو، ظلم کو، بیداد کو، قید فراواں کو

اس قسم کے صنائع و بدائع کی مثالیں واجد علی شاہ کے کلام میں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ اُن کی ذہنی کاوش اور علمی قابلیت، دونوں پر حیرت ہوتی ہے۔

اب کچھ محاورہ بندی کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں:—

اُٹھو، اُٹھو، چلو، محفل بڑھاؤ، رات گئی
غضب ہوا جو یہاں وہ جگر جلا آیا

جا رے جا! بس یہی انصاف کیا کرتا ہے
بے خبر حیف ہے، گھر سے بھی نہ باہر نکلا

سُن رکھو اے، دل کا لگانا نہیں اچھا
دُنیا یہ بُری ہے، یہ زمانا نہیں اچھا

تم مہربان تھے تو سبھی مہربان تھے
تم کیا خفا ہوئے کہ زمانہ خفا ہوا

نہ جلا خانۂ صیاد، نہ گُل مُرجھائے
اب نہ کچھ ہوگا، ان آہوں کا اثر دیکھ لیا

وا کچھ ایسی چلے ابھی کہ گر پڑے خود ہوا سے آنچل
دو کھڑکیوں سے بھی جھانکتے ہیں تم کھڑکیوں میں لٹکا کے آنچل
د میرے قدموں کی چاپ پائی تو بن کے بستر پہ سو گئے وہ
جو میں نے تلووں میں گدگدایا الٹ دیا مسکرا کے آنچل
ضرور فتنہ بپا کرے گا، ضرور ڈھائے گا کوئی آفت
یہ تیرا اٹکھیلیوں سے چلنا جھکا کے گردن اٹھا کے آنچل

زبان کے ان چٹخاروں سے واجد علی شاہ کا کلام بھرا پڑا ہے۔ غزلوں
ے زیادہ محاورات اور بول چال کا لطف مثنویوں میں ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ پر
بان کا ایک مکمل نمونہ ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس شعر کو پہلے چنا جائے
ور کس شعر کو بعد میں۔

نیا دور، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء

ایک طنزیہ خاکہ

انجمن مصنفین اُردو

کل ہند اُردو کانفرنس، جسے یہ تاریخی عظمت تو بہرحال حاصل رہے گی کہ مولانا آزاد نے اپنی آخری تقریر اسی کانفرنس میں کی تھی، پوری ہما ہمی کے ساتھ جاری تھی کہ دوسرے روز ۱۹ر فروری ۱۹۵۸ء کو ایک صاحب اپنے ہی اپنوں کو ایک چھوٹا سا پرچہ بانٹتے نظر آئے۔ اس دعوت نامے میں دو باتیں کہی گئی تھیں، ایک تو یہ کہ اُردو کانفرنس کے اس نمائندہ اجتماع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کل ہند مصنفین اُردو کی تشکیل کی جائے۔ دوسرے یہ کہ ان کے اقتصادی مسائل کا حل نکالا جائے۔

میرا دھیان پہلے اُردو ادیبوں کے اقتصادی مسائل کی طرف گیا۔ میں سوچنے لگا کہ آخر کیا مسائل ہیں اور اُن کا کیا حل تلاش ہو سکتا ہے۔

میرے ذہن میں ایک ادیب کا سب سے پہلا مسئلہ، خواہ وہ اُردو کا ادیب ہو یا ہندی کا ادیب، یہ آیا کہ اُسے ایک گوشۂ عافیت نصیب ہو، جہاں بیٹھ کر وہ اپنے تاثرات قلمبند کر سکے۔ یہ گوشۂ عافیت اُسے اپنے ہی گھر میں حاصل ہو۔ یہ تو

مجھے بہت بڑی بات نظر آئی، اس لیے خیال ہوا کہ شاید ہمارے ادیبوں کی خواہش
ہے کہ ایک دارالادب سا بنایا جائے جہاں عارضی ہی طور پر سہی انھیں یہ سہولت
حاصل ہو کہ وہ آرام سے بیٹھ سکیں اور اطمینان سے کام کر سکیں۔ اس خیال کی حمایت
میں معاً جذبی کا یہ شعر یاد آیا ؎

لے مجھ کو غم سے فرصت تو سُنا دوں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

مگر اس کے بعد ہی پے در پے کئی شعر دوسرے مضمون کے بھی یاد آئے مثلاً ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اور ایک نہیں کتنے ہی مصنفین کی تصویریں آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں جو اپنی
زبان بے زبانی سے کہہ رہی تھیں کہ زندگی کی تلخیاں اور سختیاں ہی تو انسان کو ادیب
بناتی ہیں آپ اچھے ادب نواز ہیں کہ اس سوتے کو ہی بند کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ مگر
میرے ذہن نے مخالفت برائے مخالفت کی اجازت نہیں دی اور اس تجویز کو بلا
رد و قدح مان لیا کہ ہمارے ادیبوں کے لیے بھی ایک گوشۂ عافیت ضرور ہونا چاہیے۔

ادیبوں کا دوسرا مسئلہ میرے ذہن میں یہ آیا کہ کچھ گزر بسر کا بھی انتظام ہو
اس لیے کہ کتنے ادیب ہیں جن بے چاروں کی ساکھ اتنی گر چکی ہو کہ اب انھیں قرض
بھی نہیں ملتی۔ مگر یہ بات کچھ اتنی غیر ادیبانہ نظر آئی کہ اس پر دل جما نہیں۔ پھر
بعض علمی مشغلے بھی یاد آئے جن میں اکثر و بیشتر مصنفین لگے ہوتے ہیں اور وہ کافی
نفع بخش ہیں مثلاً فلمی گیت کہنا، فلمی کہانیاں لکھنا وغیرہ وغیرہ ایسے کام ہیں جو جتنے

سود مند ہیں، اور فلمی دُنیا کی رُوز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے ابھی پچاس سال تک
اس کا کوئی خطرہ نہیں ہو کہ مانگ کم ہو جائے اور سپلائی زیادہ ہو جائے۔

رہے وہ ادیب جو اتنا دم خم نہیں رکھتے کہ اس اکھاڑے میں اُتر سکیں اُن کے
لیے حکومت نے گھر بیٹھے پنشن کی اسکیم چلا دی ہے۔

جو پنشن کے بہ قدر بھی حکومت سے ناتا جوڑنا نہیں چاہتے اوّل تو ان کی عقل
پر رونا آتا ہے اس لیے کہ جمہوری دور میں حکومت ایک عوام ہی کا ادارہ ہوتی ہے پھر
اس سے بچنا بھی کیا معنی! مگر رزق کا دروازہ ان کے لیے بھی بند نہیں ہے۔ جاسوسی
ناولوں اور رومانی ناولوں کا ایک بہت بڑا بازار موجود ہے، جہاں پیسے کے پیسے
ملتے ہیں اور انسان مصنف کا مصنف بن جاتا ہے۔ یہ ادبی بیوپاری کوئی نظریاتی
تعصب بھی نہیں برتتے۔ چاہے روس کے ناولوں سے کوئی خاکہ اڑا لائیے، چاہے
امریکہ کے ناولوں سے کوئی پلاٹ اخذ کر لائیے۔ انھیں کام لینا ہے اور دام دینا
ہے۔ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا نام ضرور دیجیے، ان کے پڑھنے والے نام پر
نہیں جاتے، کام دیکھتے ہیں۔ یہ شخصیت پرستی تو سفید پوشوں کے صرف حلقے میں
ہے کہ وہ پہلے لکھنے والے کا نام دیکھتے ہیں پھر کتاب لیتے ہیں۔

پچھلے دنوں سے مذہبی ادب نے بھی ایک خاص جماعت کی سرپرستی میں اپنے
خزانے کھول دیے ہیں۔ کم از کم لکھنؤ سے تو ایک رسالہ بڑے آب و تاب سے نکلتا
ہی ہے جس میں لکھنے والوں کو سنا ہے بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ معاش کا مسئلہ ادیبوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ دوسری
بات ہے کوئی کھ تپی بنا چاہے ورنہ پیٹ پالنے کے لیے ہزاروں ادبی راہیں کھلی

ہوئی ہیں۔ لیکن جو کٹھ پتلی بننا چاہے وہ اُنکا ہی کیوں نہ چلائے! ادب کے پیچھے کیوں
جان کھپائے۔

ہاں اشاعت و طباعت ضرور ایک ایسا مسئلہ نظر آیا جس پر غور کرنے کی
ضرورت ہے۔ آج کل ناشرین اور مصنفین کا وہی حال ہے جو ایک زمانے میں
آجر و مزدور کا تھا۔ ایک زمانہ اس لیے کہ بدلتے ہوئے نظریات کے اس دور میں
نہ جانے کس روز سرمایہ اور مزدور کے سلسلے میں بھی نیا فرمان جاری ہو جائے۔
جس ادیب کو دیکھیے سوائے اُن چند کے جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں یا
اتفاق سے خود ہی مرفہ الحال ہیں، وہ یہی شکایت کرتا ہوا نظر آئے گا کہ وعدہ
تو کیا سو کا دیے چالیس، وہ بھی پچاس پھیروں میں۔ دس ایڈیشن چھاپ چکے ہیں
مگر جب پوچھیے کہتے ہیں ابھی پہلا ہی ایڈیشن نہیں نکل پایا۔ کٹھ پتلی ناشرین بھی
جو ہزاروں روپے ٹیکس میں دے دیتے ہیں، ہزاروں انعام میں بانٹ دیتے
ہیں جب تک غریب مصنف کا پیٹ نہ کاٹیں انھیں بزنس کا لطف ہی نہیں آتا
اور پیسے ملتے ہیں تو بس حکومت سے یا انجمن ترقی اُردو سے۔ مگر حکومت
اپنے زاویۂ نگاہ سے جانچ کرتی ہو، انجمن اپنی کسوٹی لگاتی ہو، اس نکتے کو کوئی پہنچا
ہی نہیں کہ تخلیق جو بھی ہوگی وہ ادیب کے نظریے کے ماتحت ہوگی جس کے لیے
قطعاً ضروری نہیں ہو کہ وہ اس کے مطابق ہو یا اُس کے مطابق۔ مطابقت ہی
ہوئی تو انفرادیت ہی کہاں رہی اور انفرادیت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس کا سب سے
بڑا خطرناک رد عمل یہ ہوتا ہے کہ ادیب میں ایک طرح کی افسردہ مزاجی پیدا ہونے
لگتی ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ کسی کا مجموعہ حکومت نے شائع کرا دیا، کسی کا انجمن نے

لے لیا تو اس کا خون کھول کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے دل میں یاسیت یا
قنوطیت جڑ پکڑنے لگتی ہے جو ادیب کے حق میں زہر ہلاہل ہے۔

ایک تو یوں ہی ہمارے ادیبوں کی محفل میں کچھ عرصے سے تعطل سا پیدا
ہے۔ جو وطن پرست تھے وہ غرور آزادی کے چوچلے چاٹنے میں لگے ہوئے ہیں،
جو عالم پرست تھے وہ نیرنگیِ عالم کی حیرانیوں میں پڑے ہیں۔ اگر ایسے وقت میں
یاسیت یا قنوطیت نے بھی کسی گوشے سے سر اُٹھایا تو ادیب کا خدا حافظ ہے۔
اس لیے خیال ہوا کہ اجتماع کا مقصد واضح ہو یا نہ ہو مگر زعمائے ادب کی اس محفل
میں چلنا ضرور ہے۔

گو یہ بات ذہن میں کھٹکتی ہی رہی کہ ایسی کون سی انجمن ہو سکتی ہے جس میں
ترقی پسند و غیر ترقی پسند، جمہوریت پسند، آمریت پسند، مذہبیت پسند و دہریت پسند
غرض ہر پسندیدہ و ناپسندیدہ مکتبِ خیال کے مصنفین شریک ہوں یعنی اس میں جو
بھی آیا ہو وہ محض مصنف کی حیثیت سے آیا ہو اور معتقدات و نظریات اپنے اپنے
گھر ہی چھوڑ آیا ہو، اور اس سے زیادہ پریشانی یہ لاحق رہی کہ بفرض محال مصنفین نے
اپنے نظریات کے خول اُتار بھی پھینکے اور جماعت کے بھلے کے لیے اپنی اپنی شخصیتیں
مٹا بھی ڈالیں تو جادہ کیا ہوگا! منزل کیا ہوگی؟ پھر بھی جو طے کر لیا طے کر لیا،
اور وقتِ مقررہ پر اجتماعِ مصنفین میں پہنچ ہی گئے۔

پہلے تو ایک ہو کا عالم نظر آیا۔ نہ آدم نہ آدم زاد بس خدا کی ذات، پھر ایک
ایک کر کے لوگ آنا شروع ہوئے۔ سب سے پہلے سجاد ظہیر آئے، احتشام حسین آئے،
”ظومے“ صاحب آئے، جذبی صاحب آئے، جب یہ حضرات پابندیِ وقت کی

سرِ بھگت پڑھکے اور احتشام صاحب نے چلنے کے بل کی صورت میں جرمانہ بھی نقد ادا کر دیا، تو مہتمم اعلیٰ جناب عتیق صاحب نے نزولِ اجلال فرمایا، اور اُن کی قیادت میں سب پنڈال کی طرف چلے، دھیرے دھیرے سب ہی جمع ہو گئے۔ صدارت کی تجویز پیش ہوئی اور سب نے بلا اختلاف کوثر چاندپوری کو صدر مان لیا۔ اتنا بڑا مرحلہ اور آناً فاناً طے ہو گیا۔ سچ ہے بڑوں کی بڑی بات۔

صدر کے داہنے ہاتھ پر معاون، مشیر یا سکریٹری کی حیثیت سے جناب عتیق صاحب جلوہ افروز ہوئے۔ باقی حضرات کی نشستوں کی ترتیب یہ تھی۔ مگر اس میں کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔

دائیں بازو میں جو حضرات تھے اُن میں سجاد ظہیر، حمیدہ سلطان، احتشام حسین، آل احمد سرور، ڈاکٹر مسعود حسن اور روش صدیقی بہت نمایاں بیٹھے تھے، گو غیر نمایاں حضرات میں بھی کم ممتاز ہستیاں نہیں تھیں، مگر میری بدبختی کہ میں اُن کو پہچانتا نہیں تھا۔

بایاں بازو پہلے تو صرف گوپی ناتھ سنبھالے ہوئے تھے اور وہ پُرامن ہی نہیں پُرسلیقہ بھی تھا۔ اس لیے کہ اِدھر کوئی بھی جوتے پہنے ہوئے فرش پر نہیں بیٹھا تھا، چنانچہ امن صاحب نے جناب صدر صاحب کی توجہ بھی دلائی جس پر ہنسی ہو کر رہ گئی۔ مگر جب گوپال متل صاحب آگئے، بایاں بازو صحیح بایاں بازو معلوم ہونے لگا۔ آتے ہی تو انھوں نے یہ چوٹ کی کہ جناب صدر سے محفل میں شرکت کی اجازت مانگی اور کہا کہ مجھ کو تو اس نشست کی خبر ہی نہیں تھی اتفاقاً آگیا ہوں۔

دائیں اور بائیں بازو کے بیچ کے حلقے میں غلام ربانی تاباں، باقر مہدی، ظ۔

انصاری، معین احسن جذبی، مخدوم محی الدین، علی جواد زیدی سی مقتدر ہستیاں دوسرے اکابرین کے ساتھ ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

بعض مصنفین اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ محفل میں شریک بھی ہیں اور نہیں بھی شریک ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر امین سلونوی صاحب تھے۔ اور جناب بیکس اکبرآبادی ، ۔ خواتین کی ایک ٹولی بھی بائیں بازو سے الگ مگر اُسی کے کونے میں بیٹھی ہوئی تھی جس میں سب سے زیادہ سرگرم حصہ زہرہ جمال صاحبہ نے لیا۔

جو شریک بھی نہیں تھے مدعو بھی نہیں تھے مگر دہلی میں موجود تھے ان میں میرے خیال میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر غلام احمد فرقت مصنف 'مدادا'، شمیم کرہانی اور امیر حسن نورانی تھے۔

تھوڑی دیر میں کارروائی شروع ہوئی، جناب صدر نے شکریے اور انکسار کے رسمی مگر پُرخلوص ارشادات کے بعد آغازِ بحث کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تو تعطل سا رہا، سب ایک دوسرے کا منھ تکتے رہے، پھر جو گل افشانیِ گفتار شروع ہوئی تو کچھ نہ پوچھیے، جو ہے وہ اپنی کہہ رہا ہے، کوئی کسی کی سُن نہیں رہا ہے۔

بات یہاں سے شروع ہوئی کہ جس طرح دوسری زبانوں کے ادیبوں کی انجمنیں ہیں اسی طرح اُردو ادیبوں کی بھی انجمن ہونا چاہیے، لیکن قبل اس کے کہ ان میں کسی انجمن کے نظم و ضبط پر روشنی ڈالی جائے اور زیرِ تجویز انجمن کی تشکیل کے لیے ایک مثال پیش کی جائے سوال یہ ہوا کہ یہ انجمن الگ ہوگی یا انجمن ترقی اردو

سے وابستہ رہے گی۔ ابھی آزادی و الحاق پر اظہارِ خیال ہو ہی رہا تھا کہ گوپال
متل صاحب نے جو انجمن کی کارروائی ہو چکنے کے بعد تشریف لائے تھے بلا کسی تمہید
کے سرے سے انجمن کی تشکیل ہی کی مخالفت کر دی اور نوک جھونک کا سلسلہ
شروع ہو گیا۔ جس میں جناب عتیق صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ اتنی بڑھی کہ آخر
علی جواد زیدی صاحب کو ٹوکنا پڑا، اور حاضرینِ جلسہ کی آزادیِ خیال کی
مدافعت کرنا پڑی، میں تو سمجھا کہ جلسہ یہیں پر ختم ہو گیا، مگر سجاد ظہیر صاحب نے
جو اس تمام عرصے میں خاموش بیٹھے ہوئے تھے گوپال متل صاحب کی تقریر سے
ایک اعتدال کا راستہ یہ نکالا کہ انجمن نہ سہی فورم ہی بن جائے جس پر گوپال متل
صاحب کو اتفاق ہے۔ مگر اُن کی تقریر سے ایک نیا اُلجھاوا پیدا ہو گیا وہ
یہ کہ انجمن مصنفین رہے تو انجمن ترقی اُردو سے الگ لیکن اس کا ابتدائی کام
یعنی خط و کتابت انجمن ترقی اُردو ہی انجام دے۔ یہ ایسی بات تھی جس پر
آلِ احمد سرور ظاہر ہے چپ نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تقریر میں
بصد ادب عرض کیا کہ میں ذاتی طور پر ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں مگر انجمن
ترقی اُردو کی طرف سے یہ خدمت انجام دینے سے قاصر ہوں۔

آخر یہ طے پایا کہ پہلے کل ہند پیمانے پر مصنفین اور ادیبوں کی رائیں
معلوم کر لی جائیں۔ مصنف کی تعریف تو خیر واضح تھی "صاحبِ تصنیف"
مگر ادیب کی تعریف بحث و مباحثے کے بعد یہ قرار پائی کہ ہر وہ شخص ادیب ہے
جو اپنے آپ کو ادیب سمجھے۔ اب استصواب رائے کا کام اتنا بڑھ گیا کہ مل بانٹ
کر ہی کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ہر ریاست کے لیے منتخب ادیبوں کی ایک

کمیٹی بنا دی گئی جو اپنے اپنے حلقوں میں اُردو ادیبوں کی رائیں جمع کرے گی،
پھر دیکھا جائے گا۔ باد زندہ صحبت باقی۔

نوٹ

جن ادیبوں اور دانش وروں کے اسمائے گرامی سہواً چھوٹ گئے ہیں
اُن سے ہم بصد احترام معذرت خواہ ہیں۔

ادارہ وطن لکھنؤ

مجاز :- کچھ یادیں، کچھ باتیں

سنہ ۳۲ء کا زمانہ تھا، مجھے علی گڈھ میں داخلہ لئے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے، کہ ایک روز عثمانیہ کے برآمدہ میں کسی نے ایک صاحب سے تعارف کرایا، سر پر کشمشی رنگ کی مخملی ٹوپی، جس کی دیوار ذرا چوڑی سی، جسم پر یونیفارم کے رنگ کی نیلی شیروانی، جس پر سفید بٹنوں سے مہین مہین دھاریاں پڑی تھیں، اور شروع سے آخر تک سارے بٹن لگے ہوئے تھے، علی گڈھ کٹ پاجامہ، براؤن رنگ کا شو، بغل میں کتابیں، لمبا سا قد، سانولا سا رنگ، دبلا سا بدن، چہرے پر متانت و سنجیدگی، معلوم ہوا کہ آپ اسرار الحق مجاز ہیں، لکھنؤ کے رہنے والے اور ایک ہونہار شاعر، میں نے ہاتھ ملایا، تو ایسا نرم و نازک ہاتھ کہ زیادہ تپاک دکھانے کی جرأت نہ ہوئی، باتیں شروع ہوئیں تو پتہ چلا کہ دراصل قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں، جو تصوف کا گہوارہ، اور علم و ادب کا فوارہ ہے۔ ابتدائی تعلیم امین آباد ہائی اسکول میں پائی ہے اس لئے والد مرحوم کے شاگرد بھی ہیں جو وہاں مدرس فارسی تھے، اسکے بعد جہاں جہاں

مجاز کے والد کا تبادلہ ہوتا رہا، وہاں وہاں پڑھتے رہے۔ علیگڈھ آنے سے پہلے سینٹ جانس کالج آگرہ میں تھے، اب بی اے سیکنڈ ایر میں ہیں، میں فرسٹ ایر میں تھا، مجاز سے ایک سال جونیر۔ علیگڈھ میں ایک دن کے جونیر سے بھی سیدھے منھ بات نہیں کرتے تھے، وہ ایک سال کے جونیر سے اس برابری سے مل رہا ہے، فرنگی محل اور اپنے بزرگوں کے تعلقات بتا رہا ہے، یہی نہیں مجھے استاد زادہ کی عزت بھی عطا کر رہا ہے، ظاہر ہے کتنا شریف آدمی ہے۔

دوسرے روز پھر اسی وقت سامنا ہوا، فرسٹ ایر اور سیکنڈ ایر کے انگریزی کے سبق ایک ساتھ ہی بلاک میں ہوا کرتے تھے، اسلئے ہر روز عثمانیہ کے برآمدہ میں آنا جانا رہتا تھا۔ مجاز نے علیگڈھ کے "السلام علیکم" کے بجائے لکھنؤ کے "آداب عرض" سے کلام کیا، بڑی اپناہٹ محسوس ہوئی، ساتھ ہی یہ ندامت بھی، کہ میں نے کیوں نہ پہل کی، بے اختیار رک گیا، اور پوچھا۔ آپ یہاں کس ہال میں ہیں؟ —

"نہ پوچھئے کس حال میں ہوں، اپنا حال ڈے اسکالر کا حال ہے" "ہیں میرس روڈ پر رہتا ہوں"۔ اُنھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ٹھہر گیا —— "پھر کیا ہے خالی گھنٹوں میں 'ممتاز' آجایا کیجئے، میں سامنے ہی ۲۲ میں رہتا ہوں"۔

مجاز نے بخوشی میری دعوت قبول کر لی۔ خالی گھنٹوں میں تو شاذ ہی میرے یہاں آیا ہو، مگر پڑھائی کے بعد سہ پہر کو اس کا ممتاز ہاؤس آنا ایک معمول سا بن گیا، مہینوں کے علیگڈھ کے قیام میں یہ پہلا شخص تھا جس نے آتی کھائی نہ شناسائی، تکلف کیا نہ تصنع، اور اس سے ربط ضبط بڑھنے لگا، ورنہ علیگڈھ میں جس سے بھی دوستی ہوئی پہلے ٹھن ٹھن ضرور ہوئی۔ بات یہ ہے کہ کوئی لکھنوی ہو یا دہلوی،

علیگڈھ پہنچا نہیں عرکش کوٹ پہنا نہیں کہ گھر کی تہذیب اُسنے بالائے طاق رکھ دی ہو۔ وہاں کی شوخ و طرار تہذیب میں غرق ہو گیا۔ مجاز کے والد، والدہ، بھائی بہنیں سب ہی علیگڈھ میں تھے، چند گھنٹے یونیورسٹی میں رہنا، باقی وقت گھر میں گزارنا، اور گھر بھی ایسا جس میں سب ہی اسکے چاہنے والے تھے، مجاز کی والدہ تو اس پر جان ہی چھڑکتی تھیں، اسلئے مجاز کی گھر کی تہذیب وہاں بھی قائم رہی، پھر اپنا اپنا مزاج بھی ہوتا ہے، اسی گھر کی فضا میں انصار بھی تھے، مگر اُن پر علیگڈھ کی چھاپ اتنی گہری تھی، کہ ان میں اودھ کی تہذیب کی چھینٹ بھی مشکل سے نظر آتی تھی، وہ کئی کئی دن بھی گھر سے غائب رہتے، تو کسی کو تشویش نہ ہوتی۔ مجاز ذرا وقت سے بے وقت ہو جاتے تو سارا گھر اُن کے لئے بیتاب رہتا، جیسے چھوٹے بچے کے لئے نہیں فکر رہتی ہے کہ رستہ نہ بھول گیا ہو کسی کے بہکانے میں نہ آ گیا ہو، ویسے ہی مجاز کی طرف سے اسکی والدہ کو دھڑکے لگے رہتے تھے، کہ کسی کے بہلانے میں نہ آ جائے، کسی کے پھسلانے میں نہ آ جائے، اس میں ان کی محبت کو کتنا دخل تھا اور مجاز کی نیکی و معصومیت کو کتنا دخل، یہ بتانا مشکل ہے، دونوں ہی کارفرما تھے، مجاز کی نیکی بھی، اور اسکی والدہ کی بے پناہ محبت بھی۔ اِس لاڈ پیار اور دیکھ بھال نے مجاز میں کوٹ کوٹ کر محبت بھر دی تھی، اور اس کو ایسا خوش اوقات و خوش اطوار بنا دیا تھا کہ آج جو سُنے گا حیرت کرے گا۔

یونیورسٹی کے بعد پابندی سے گھر پہنچنا، دوپہر کو آرام کرنا، چار بجے نہا دھو کر چائے پینا، کپڑے بدلنا، ٹہلنے ٹہلانے، ملنے ملانے کیلئے باہر نکلنا،

اور رات کے کھانے سے پہلے ہی گھر واپس آ جانا، وہ بے ترتیبی جو کالج کے زمانہ میں آ ہی جاتی ہے، نہ اُٹھنے کا ٹھیک ہے نہ بیٹھنے کا ٹھیک ہے، وہ خود نمائی اور خود پسندی جو ہاسٹل اور یونیورسٹی کی دُنیا میں چھوٹی چھوٹی کامرانیوں سے پیدا ہو ہی جاتی ہے، اور وہ رکیک مزاجی جو وقت بے وقت پیسے ختم ہو جانے سے عود کر ہی آتی ہے، مجاز کی مرفع الحال زندگی میں قریب بھی نہ آنے پائی تھی۔ عام طالبعلموں کے برعکس اس کی زندگی آسودہ اور منضبط تھی۔ جب گھر سے نکلتا تو ایک ڈبیا گولڈ فلیک اور ایک ڈبیا دیا سلائی کی جیب میں ڈال کر، دو ایک روپئے بھی جیب میں پڑے ہی رہتے میرے یہاں قریب قریب ہر شام کو پہنچتا تھا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سگرٹ کا پہلا دور اُسی نے نہ چلایا ہو۔ مجاز کے ہم سبق مشترف میاں بھی میرے گہرے دوست تھے۔ صورت سے دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے اور دوستی بھی کرنا چاہتے تھے، مگر جب میں نے تعارف کرایا ہے، اور روز کا اُٹھنا بیٹھنا ہوا ہے تب جا کر مجاز سے دوستی ہوئی ہے، اور بے تکلفی میں تو پھر بھی بہت دن لگے۔

جو دوستی میں یہ رکھ رکھاؤ برتے، وہ حُسن و عشق میں ظاہر ہے کتنی خودداری اور پردہ داری ملحوظ رکھے گا۔ اس کو وہ بے باکی اور بے حجابی پسند ہی نہیں تھی جس پر عام طور سے نوجوان شاعر جان دیا کرتے ہیں۔

مجاز پُرانی اصطلاح میں مہذب نوجوان تھا، وہ حُسن کے جھرمٹ میں بھی رہ کر اپنی تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے دے سکتا تھا۔ دوسروں کے حوصلے تھے، کہ گرلس کالج میں ان کا نام پہنچ جائے، کلام پہنچ جائے، اور پیام و سلام آ جائے تو شادیٔ مرگ ہی ہو جائے، مجاز اسی سیرس روڈ پر رہتا تھا جو گرلس کالج ہی کیلئے بنی

اور بھی انتخاب روزگار ہستیوں کیلئے مشہور تھی، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یو سارے علیگڑھ کی جنتِ نگاہ تھی، مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ مجاز کے مُنہ سے ایسے قصے سُننے ۔ جو دوسروں کی بابت جھوٹ یا سچ سنا کرتے تھے، اسنے جو قدریں بنا رکھی تھیں وہ یہ تھیں :- ؎

میری خودداریوں کا خون نہ کر	مُضطربِ بزمِ دلبراں نہ بنا
ماہ و انجم سے مجھ کو کیا نسبت	مجھ کو اُن کا مزاج داں نہ بنا
دل بصد پارۂ حوادث کو	تختۂ مشقِ گُلرخاں نہ بنا
میری جانب نگاہِ لُطف نہ کر	غم کو اس درجہ کامراں نہ بنا
میری ہستی نیاز و شوق سہی	اس کو عنوانِ داستاں نہ بنا

اللہ اللہ مجاز کے نیاز و شوق میں کیا تمکنت ہے کیا خودداری ہے۔

علیگڑھ کے دَور میں مجاز کا پہلا شاہکار اس کی نظم "نمائش" ہے، وہاں کی مجرّد اُور خشک زندگی میں دو ہی رنگینیاں تھیں، ایک اسٹیشن جو روز کی چیز تھی، ایک نمائش جو سال بھر بعد آیا کرتی تھی۔ اسٹیشن علیگڑھ کی زندگی میں ایک پائیں باغ بن گیا تھا جہاں جس کی بھی طبیعت گھبرائی چہل قدمی کیلئے پہنچ گیا۔ اور نمائش نے قومی تہوار کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ مجاز نے رات اور ریل اور نمائش کہہ کر دونوں ہی کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

اسی زمانہ میں جاں نثار نے اپنی نظم "گرلس کالج کی لاری" کہی تھی، یاد نہیں کہ پہلے مجاز نے "نمائش" کہی، یا جاں نثار نے "گرلس کالج کی لاری"۔ مگر قیاس یہی ہے کہ مجاز نے "نمائش" پہلے کہی تھی۔ بہرحال ان دونوں نظموں کو علیگڑھ میں بے پناہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، دونوں کا ایک ہی موضوع ہے ایک ہی خاکہ ہے۔

موازنہ مقصود نہیں ہے، اسلئے کہ مجاز اور جاں نثار ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے، اور بعد کو تو عزیز قریب بھی بن گئے تھے، شاعری میں بھی دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا ہے، شہرت بھی دونوں کی ایک ساتھ ہوئی، ایک طرف مجاز کا طوطی بولتا تھا تو دوسری طرف جاں نثار کا طوطی بولتا تھا، اور جب دونوں ایک ساتھ یونین میں آجاتے تھے، تو یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ پالا کس کے ہاتھ رہے گا، ترنم و تغزل دونوں کا جوش رہا تھا، رہتے دونوں بہت دُور تھے، جاں نثار "سی" ہال میں، مجاز میرس روڈ پر، ایک قطب شمالی تھا تو دوسرا قطبِ جنوبی، مگر وہ حریفانہ چشمک جو میر و مرزا کے وقت سے چلی آرہی ہے، مجاز و جاں نثار کے قریب بھی نہ آنے پائی تھی، پھر موازنہ کیسا؟ لیکن مجاز کی افتادِ طبع پر روشنی ڈالنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "نمائش"، اور "گرلس کالج کی لاری"، کا ایک ساتھ ذکر کیا جائے۔ جاں نثار سے "گرلس کالج کی لاری"، اور مجاز سے "نمائش" سُنانے کا اتنا زبردست اصرار ہوتا تھا کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا، مگر گرلس کالج کی لاری میں جاں نثار کی شوخ کلامی اتنی بڑھ گئی ہے اور اس کا مشاہدہ اتنا بیباک ہوگیا ہے کہ آج اس سے کہا جائے تو شائد اسے پڑھنے میں بھی تکلف ہو۔ اسکے برعکس نمائش کا حُسن و جمال ویسا ہی قائم ہے، جو نہ بھی جانتا ہو کہ یہ دوشیزگانِ نازپرور جو ایک بساطی کی دُکان پر کھڑی ہیں، اور اپنے پیرہن کی خوشبو سے دُور تک کی فضا کو معطر کئے ہوئے ہیں کون ہیں؟ وہ بھی نمائش کو پڑھ کر بہ آسانی سمجھ جائے گا کہ یہ دیکھنے کی چیزیں ہیں چھیڑنے کی نہیں۔

مجاز ان کی شوخیاں اور رعنائیاں دیکھ کر مچل نہیں جاتا ہے، حالانکہ اگر وہ بہک جاتے تو غلط نہ ہوگا، ایک تو اُس کا سِن و سال، دوسرے علیگڑھ کی بے کیف زندگی میں ایسے

ـرح پرور نظارے بیس سال پیچھے نمائش ہی میں دیکھنے میں آتے تھے، اور جگہوں میں تو
ـور ہی بساطی کی دُکان پر میلے لگے رہتے ہیں، وہاں بساطی کی دُکان ہی نہیں پھر
ـیسے خریدار کہاں سے آئیں جن کو دل و جان بھی کوئی تحفت دیدے، لیکن
ـجاز کا دل و دماغ دونوں قابو میں رہتے ہیں، نہ خود بہکتا ہے نہ دوسروں کو
ـبہکنے کی اجازت دیتا ہے، اک آہِ سرد کل بھی جاتی ہے تو فوراً اس پر تازیانۂ ہوش
ـگا دیتا ہے، اور کہتا ہے ــــــــــــ ع

"ہنسی پھر آگئی اپنے کیے پر"

مجاز کا شوق کتنا ہی بیتاب ہو، مگر اسکے ذوق کا پہرہ اتنا سخت ہے اور ادراک کی
ـرفت اتنی مضبوط ہے کہ ارمانوں کی حشر انگیزی کے باوجود اس کی زبان سے ایک بھی
ـبات ایسی نہیں نکلتی جس سے ان دلبرانِ خاص کی توقیر میں کمی آجائے۔ دادِ حُسن دینا
ـشاعر کا فرض ہے، مجاز بھی داد دیتا ہے اور جی کھول کر دیتا ہے ــــــــــــ ؎

کوئی آئینہ دارِ حُسنِ فارس — کسی میں حُسنِ یونانی کے جوہر
کسی پر عکسِ معصومِ کلیسا — کسی میں پرتوِ اصنامِ آذر
یہ شیریں ہے وہ نوشابہ ہے شاید — نہیں یاں فرقِ فرہاد و سکندر
یہ اپنے حُسن میں مغرور لیکن — وہ اپنے ناز میں کلمائے اختر
یہ تابانی میں خورشیدِ درخشاں — وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر
یہ شعلہ آفریں وہ برقِ افگن — یہ آئینہ جبیں، وہ ماہ پیکر

مگر یہ بے اختیار واہ واہ بھی حُسن کے مدارج بلند سے بلند تر کرتی جاتی ہے اور وہ پر عجب
ـتیور جن کی طرف اسنے شروع ہی میں اشارہ کر دیا ہے آخر تک حُسن و جمال کی نگہبانی

کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ کسی کی حسرتیں پائمال کرتی، کسی کی حسرتیں ہمراہ لیکر و
مُسکراتی ہیں، اور ایک جانب چلی جاتی ہیں۔

انہی میں وہ بھی ہیں جو اس نظم کی محرک ہیں، اور ایک شعر میں اُنکا نام بے اختیار
آ بھی گیا تھا، مگر وہ ہمیں لوگوں تک رہا، نظم میں شامل نہیں ہوا۔ مجاز کی یہی پردہ دار
جو اُسے اپنے دور کے ترقی پسند شاعروں میں ممتاز کرتی ہے، اسکے یہاں حُسن کو پشیمان کرنا عشق
کی توہین ہے، اور عشق کو رسوا کرنا حُسن کی توہین ہے۔ اُس شائستگی نے جو مجاز کی گھٹی
میں پڑی تھی، اُسکے شاہدِ خیال کو کبھی پردہ سے باہر نہیں آنے دیا۔ وہ پردہ نہیں
جس میں قدیم شعرا اپنے محبوب کو بند رکھتے تھے، بلکہ وہ پردہ جو ایک ہالا بن کر
چاند اور ایک فانوس بن کر شمع کی رونق کو دوبالا کر دیتا ہے۔ مجاز کو اختر شیرانی کی
رومانیت بہت پسند تھی، مگر وہ اپنی سلمیٰ کا نام زبان پر نہیں لاتا ہے، اس کی
خودداری ایسی وارفتگی کی اجازت نہیں دیتی، جس میں ہوش کا کوئی طور باقی
ہی نہ رہے۔ اسی ہوشمندی نے مجاز کی غزل سرائی میں ایک نیا لطف پیدا
کر دیا ہے، کہیں قدیم شاعروں کا سا رنگ جھلکتا ہے، اور وہ چٹخارہ ملتا ہے
جو جدید شاعروں میں مفقود ہے، تو کہیں جدید شاعری ایسے بانکپن کے ساتھ
نکھر آتی ہے کہ بس دیکھا کیجئے۔

مجاز کے اس ابتدائی دور کی ایک نہیں کتنی غزلیں ہیں جو اُسنے تقریباً
فی البدیہہ کہی ہیں، اور ایسی کہی ہیں کہ غزلوں کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتخاب بھی شاید
ان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ــــــــــــ چند شعر جو یاد ہیں اور ہمیشہ
یاد رہیں گے، حسبِ ذیل ہیں :- ؎

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہوگیا ہوں میں
یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں
تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دُنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں
مجھے سُنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت
مجازؔ ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم
میری میخواری ابھی تک راز ہے
ساری محفل جس پہ جھوم اُٹھی مجازؔ
وہ تو آوازِ شکستِ ساز ہے

زورِ شوق سے اب ہٹا چاہتا ہوں
کششِ حُسن کی دیکھنا چاہتا ہوں
وہ مخمور نظریں وہ مدہوش آنکھیں
خرابِ محبت ہوا چاہتا ہوں
کہاں کا کرم، اور کیسی عنایت
مجازؔ اب جفا ہی جفا چاہتا ہوں

سینے میں اُن کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں
ے گنہگار، گنہگار ہی سہی
تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں
مٹتے ہوؤں کو دیکھ کے کیوں رو نہ دیں مجازؔ
آخر کسی کے ہم بھی مٹائے ہوئے تو ہیں

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہئے، بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے
اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہئے کیا کیا گذری
آئے تھے سوادِ اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے
اُس محفلِ کیف و مستی میں اُس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

یہ غزل جس کے شعر سب سے آخر میں دیئے گئے ہیں، مجازؔ نے اس حال میں کہے تھے کہ نہ کاغذ نہ پنسل تھی۔ ہم دونوں دہلی جا رہے تھے، اسلئے کہ ایک دن پہلے وہ "سوادِ الفت" میں آئے تھے، اور "اربابِ جنوں" کو تڑپا کر چلے گئے تھے بمشکل سے چند گھنٹوں کی ملاقات رہی جس میں واقعۃً یہ حال ہوا کہ ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سُن نہ سکے اور صحبتِ یار آخر شد۔

اس "سعیِ کرم" کے بعد یہ سعیِ لاحاصل کی گئی کہ ہم دونوں دوسرے ہی دن میل سے دلی روانہ ہوگئے۔ سکنڈ کلاس کا ڈبہ تھا، آج کا سکنڈ کلاس نہیں، ۱۹۳۶ء کا سکنڈ کلاس جو اب فرسٹ کلاس ہوگیا ہے، ایک کشادہ سی برتھ پر ہم دونوں الگ الگ بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ سارا ڈبہ خالی ہے۔ کسی کے آنے کا بھی خطرہ نہیں ہے، اسلئے کہ علیگڈھ کی چھُٹی گاڑی غازی آباد سے پہلے نہیں رُکے گی پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ساری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں، نہ وہ بولتے ہیں نہ ہم بولتے ہیں۔

مجازؔ کھڑکی پر ہاتھ اور ہاتھ پر ٹھڈی رکھے باہر جھانک رہا ہے، میں باہر بھی

نہیں دیکھ رہا ہوں ایک غوطہ میں پڑا ہوا ہوں، بات ہی ایسی تھی، کسی کا بلا اطلاع
بلا خبر دلّی سے آنا، ہم دونوں کا ایک ہی جگہ مل جانا، اور ابھی کچھ کہنے سننے کی نوبت بھی
نہیں آئی تھی کہ ۳ بجے رات کی گاڑی سے واپس جانا ایسی عنایت تھی، ایسی جرأت تھی
کہ اس پر جتنی بھی حیرانی ہوتی کم تھی۔ اسی حیرانی میں ہم لوگ گم صم بیٹھے ہوئے تھے اور
نہ جانے کتنی دیر بیٹھے رہے کہ مجاز نے اپنی خاص دُھن میں کہا:۔ ع

اس سعیِ کرم کو کیا کہئے، بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

اس کے بعد یکے بعد دیگرے جو مصرعے اور پورے پورے شعر صادر ہونا شروع ہوئے ہیں
تو یہ بھی ہوش نہیں کہ غازی آباد آیا کہ نہیں، ہم لوگ دلّی پہنچ گئے۔ جہاں تک یاد ہے
مطلع مکمل ہونے کے بعد دوسرا شعر "ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے" ہوا، تیسرا:—
"ارباب جنوں" والا۔ چوتھا "محفل تو تری سونی نہ ہوئی" ——— اور پانچواں ؎

اس بزمِ نشاط و مستی میں، اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

دہلی سے واپسی پر ہوا۔

اسی طرح ایک دن وہاں سے بلاوا آیا جہاں بے بلائے جانے کے لئے بھی مجاز
بیتاب رہا کرتا تھا، مگر بیتاب ہی رہا کبھی گیا نہیں۔ مجاز نے اس حسین موقع کیلئے وہ
حسین تر غزل کہی جس کا مطلع ہے ——— ؎

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

دو تین شعروں تک تو بات ڈھکی چھپی رہی، مگر جب مجاز نے یہ شعر پڑھا ——— ؎

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم!
میری میخواری ابھی تک راز ہے

تو ایک طرف کسی کی آنکھیں جھک گئیں، دوسری طرف کسی کی آواز میں تھرتھری سی آگئی،
اور ساری محفل اس شکستِ ساز پر جھوم اٹھی۔

اس پس منظر میں دیکھئے تو ہر شعر ایک ہی خیال میں لڑیوں کی طرح پرویا ہوا نظر
آئے گا، اور اسے غزل کے بجائے نظم کہنے کا جی چاہے گا۔

بہرحال آپ جو بھی کہیں اسے یہ اہمیت بھی حاصل ہے کہ سب سے پہلے
اسی کو مجاز نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیا تھا۔

ان حسین اور رنگین ملاقاتوں کے زمانہ میں ایک دن ایسا ہوا کہ سارا پروگرام
چوپٹ ہو گیا۔

ہم لوگ کہیں جانا چاہتے تھے۔ میرے اور مجاز کے ایک مشترک دوست
آفتاب ہاسٹل میں رہا کرتے تھے۔ ہم دونوں ممتاز ہاؤس سے تیار ہو کر
آفتاب ہاسٹل آئے کہ ان کو ساتھ لے لیں تو چلیں۔ وہاں جو پہنچے تو دیکھا کہ
وہ تیار ہی نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کے ایک عزیز محترم سامنے کے برآمدہ میں
کرسی ڈالے بیٹھے ہیں اور کتب بینی فرما رہے ہیں۔ یہ عزیز محترم تو ہم سب کے تھے،
اسلئے کہ بڑے سینیر لوگوں میں تھے، مگر ان کے لئے وہ ناصح مشفق کی بھی حیثیت
رکھتے تھے، اسلئے لاکھ سمجھایا کہ شام کو ٹہلنے جانا کیا بُری بات ہے، چلئے
چلیں بھی۔ یہ بھی سمجھایا کہ کسی مرد مومن کی طرف سے بدظنی نہ کرنا چاہئے۔
ہو سکتا ہے کہ کسی کے انتظار میں بیٹھے ہوں اور وقت گذاری کیلئے کتب بینی

کرنے لگے ہیں، مگر ان کی کسی طرح ہمت نہ پڑی کہ سامنے سے نکل جائیں۔ اس بیتابی و مجبوری کے عالم میں کہ نہ ان کو کرسی سے اٹھا سکتے ہیں، نہ ان کے سامنے سے نکل سکتے ہیں اور وقت ہے کہ گذرا جا رہا ہے۔ مجاز نے جلبلا کر کہا ـــــــــــــ ؎

شام کا یہ وقت اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
ہو نہیں سکتا تری اس بدمزاقی کا جواب

اب دوسرا شعر پڑھئے ـــــــــــــ ؎

رکھ بھی دے اس کتابِ خشک کو بالائے طاق
اڑ رہا ہے رنگ و بو کی بزم میں تیرا مذاق

تو شاید آپ کو بھی ایک نیا لطف آئے گا۔

مختصر یہ کہ مجاز اس زمانہ میں نغمہائے زندگی سے بھرا ہوا ایک ایسا ساز ہے جسے نہ مضراب کی ضرورت ہے نہ کسی دستِ فن کار کی۔ چمنستانِ علیگڈھ کی ہر شے اس کے لئے ایک عنوان ہے۔ وہ چاہے ذرّے ہوں چاہے تارے ہوں۔ خوش قسمتی سے علیگڈھ بھی اس زمانہ میں صحت مند و صحت بخش خیالات و نظریات کا ایک گہوارہ بنا ہوا ہے۔ وہاں مذہب پرست بھی ہیں، دہریت پرست بھی ہیں، اشتراکیت کے بھی علمبردار ہیں اور قومیت و وطنیت کے بھی پرستار ہیں، مگر یہ رسّہ کشی نہیں ہے جو آجکل علیگڈھ میں چل رہی ہے۔ سب شیر و شکر رہتے ہیں اور اس علمی آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہیں جو ایک درسگاہِ عالیہ کی شان ہے۔ آزادی اور روشن خیالی سے رچی ہوئی اس فضا میں مجاز نے بھی اپنی فکر و نظر کو آزاد رکھا۔ وہ نہ ان کا ہمنوا بنا نہ ان کا ہم خیال۔ اسی بار ہمہ و بے ہمہ مسلک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا ہے ؎

میں ہر محفل کی رونق ہوں میں ہر گھر کا اجالا ہوں

یہ مجاز جس کی صلاحیتیں بیدار ہیں، حوصلے جوان ہیں، جو غمِ روزگار سے ناآشنا ہے اور غمِ عشق ہے تو سازگار ہے، جب نغمہ سرا ہوتا ہے تو ہر ایک کو اس میں اپنے ہی دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ اس کی ہمہ گیری کا ثبوت ہے نہ اس کی ہم خیالی کا۔ خانقاہوں میں اس کا کلام پہونچتا ہے تو صوفیائے کرام رقص کرنے لگتے ہیں۔ چشم دید واقعہ ہے کہ لکھنؤ کی ایک محفلِ سماع میں جب قوال نے یہ شعر پڑھا۔

تیرے گناہگار گنا ہگار ہی سہی
تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں

تو ایک صاحبِ دل کو حال آگیا، اور قوال مالا مال ہوگیا۔

بت خانوں میں اس کا کلام پہونچتا ہے تو پتھر کے بت بھی بےچین اٹھتے ہیں، اور دنیا اسے رومانی شاعر کہنے لگتی ہے۔

اہلِ خرد جب اس کا کلام پڑھتے ہیں، تو "مزدور و دہقاں" کے ایک مبہم سے اظہار کو بنیاد قرار دے کر اپنی پسند کا ایک قلعہ بنا لیتے ہیں، اور اس میں مجاز کو قلعہ بند کر دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کی رومان پسندی اتنی توانا و صحت مند ہے کہ جو رومانیت کے خلاف ہیں وہ بھی مجاز کو اپنانا چاہتے ہیں، اور اس کی حقیقت پسندی اتنی رنگین و حسین ہے کہ جو مزدوروں اور کسانوں کے ذکر کو غیر شاعرانہ سمجھتے ہیں انھیں بھی مجاز کی شیریں بیانی میں یہ ذکر برا نہیں لگتا۔

کسی اور نے کہا ہوتا کہ وہ شاعرِ مزدور و دہقاں ہے تو یہ اس کی بے شعوری کی

خیال قرار پاتی۔ دہقاں کا لفظ صاف غمازی کر رہا ہے کہ شاعر طبقاتی کشمکش کے فلسفے سے
ناواقف ہے، مگر مجاز کو اپنانا تھا، اسلئے فرطِ محبت میں چشم پوشی کی گئی، اور اسکے کلام کو
ایسی ترتیب دی گئی جیسے وہ ۱۹۳۲ء ہی سے مزدوروں کے گیت گا رہا ہو، حالانکہ
۱۹۳۲ء وہ زمانہ تھا کہ جب مجاز تو درکنار علی سردار جعفری کو بھی یہ شعور نہیں تھا کہ مزدور
کیا ہے کسان کیا ہے، یا طبقاتی کشمکش کیا ہے۔ مجاز سیدھی سادی حسن و عشق کی
شاعری کرتا تھا اور سردار اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر مذہبی شاعری کرتے تھے
یعنی مرثیے کہتے تھے۔

خدا جھوٹ نہ بلائے تو سردار نے ۱۹۳۵ء میں جب میرے ساتھ کمرہ ۱۵ ممتاز ہاؤس
میں رہا کرتے تھے سیکڑوں بند تو میر انیس کے مقابلہ میں کہہ ڈالے تھے، اور غضب یہ تھا کہ
کہتے چلے جاتے تھے۔ اس مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ ڈرامے لکھنے کا بھی ان کو زبردست
خبط تھا۔

ان کے پاس ایک بڑی سی میز تھی جس پر ایک زرق برق میز پوش پڑا رہتا تھا۔
اس میز کے ایک کونے میں ان کے ڈراموں کی جلدیں چنی رہتی تھیں اور شکسپیر کی تصویر
رکھی رہتی تھی۔ دوسرے کونہ پر ان کے مرثیوں کی جلدیں چنی رہتی تھیں اور اسکے پاس
میر انیس کی تصویر رکھی رہتی تھی۔

ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ مارکسزم کی الف بے سے لیکر چھوٹی سی اور بڑی سے بڑی تک
بھی کتابیں مل سکیں وہ بشیر صاحب کی عنایت سے لے آئے، اسکے بعد سے
جو سردار ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔

میرے خیال میں مجاز کی شاعرانہ عظمت میں ذرا بھی فرق نہ آئے گا، اگر اسکے

کلام کو اسکے صحیح پس منظر میں دیکھا جائے، اور تھوڑی دیر کیلئے آہنگ[1] سے قطع نظر
کر لی جائے۔

مجاز نے ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ کے قیام اور جذبی کی صحبت میں (جو اس زمانہ میں ملال
تخلص کرتے تھے) شاعری شروع کی۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں آگرہ کے قیام میں فانی بدایونی سے
اصلاح لی اور میکش اکبرآبادی سے مشورے کئے۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں وہ علیگڑھ آیا، اور
۳۶-۱۹۳۵ء تک وہ علیگڑھ کے گیت گاتا رہا۔

اسی علیگڑھ میں وہ رندی شروع ہوئی جس نے اسے دہلی میں رسوا کیا، اور
لکھنؤ میں لاکر دفن کرا دیا۔ اسکے سب سے پہلی بار پینے اور پی کر بہک جانے کا واقعہ یہ ہے کہ:۔

---

[1] آہنگ میں اس غزل پر ۱۹۳۳ء پڑا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب سبطے نے (سبط حسن)
۳۹-۱۹۳۸ء میں لال باغ لکھنؤ میں ترقی پسند ادب کا اشاعت گھر قائم کیا اور اپنی مقناطیسی
شخصیت کے اردگرد مجاز، جذبی، سردار اور دوسرے ساتھیوں کو بھی جمع کر لیا، تو
آہنگ کی ترتیب بھی پہلی بار وہیں دی گئی تھی۔ اس وقت جس غزل کے بارے میں جو سنہ
یاد آیا، یا ارتقائے کلام کی رو سے مناسب سمجھا گیا وہ اس پر ڈال دیا گیا۔ اس طرح
مجاز کے کلام میں ادوار تو بڑی ہوشمندی سے قائم ہو گئے اور فیض احمد فیض کو دیباچہ
لکھنے کیلئے ساز و جام و شمشیر و آہن کا مواد بھی بہت اچھا فراہم ہو گیا۔ مگر اس
چمن بندی میں کتنے غنچہ ہائے شگفتہ و ناشگفتہ کا دانستہ یا نادانستہ خون بھی
ہو گیا ہے۔ اس کا علم لوگوں کو کم ہے۔

ایک روز اختر رائے پوری جو اس زمانہ میں بہت بڑے ترقی پسند ادیب سمجھے
یہ خبر لائے کہ ساغر آئے ہوئے ہیں، اسکے بعد یہ تجویز کی کہ رات کو ایک محفل
جم جائے۔ امتحان کا زمانہ سر پر تھا، اسلئے یہ طے ہوا کہ قلعہ میں محفل لگے گی۔
میں، اظہر اور مجاز آفتاب ہاسٹل سے چلے، اختر رائے پوری، ساغر نظامی اور
ایک صاحب اور جو ندوہ کے فارغ التحصیل تھے الگ سے روانہ ہوئے جب سب
لوگ جمع ہوگئے تو بوتل نکلی گلاس نکلے، اور شاعری و شراب دونوں کے دور شروع
ہوگئے۔ تقریباً ۱۲ بجے ہم دو آدمی اُٹھ آئے، مولانا اور میں۔ ساغر، مجاز اور
اختر رائے پوری رہ گئے۔ رات زیادہ ہوگئی تھی، میں آفتاب ہاسٹل ہی میں
رہ گیا۔ کچھ دیر مجاز کا انتظار کیا، پھر ہم لوگ سو رہے۔ نہ جانے تین بجے تھے کہ چار
کہ اظہر نے آکر دروازہ بھڑ بھڑایا، ہم لوگ اُٹھے، دروازہ جو کھلا تو سارا کمرہ
مہک اُٹھا حیرت سے پوچھا: "ہائیں یہ کیا حال ہے؟" اُسنے انتہائی بدحواسی
سے کہا: "میرا حال تو کچھ نہیں، مجاز کا حال بہت بُرا ہے" ہم دونوں نیچے
اُتر گئے، دیکھتے کیا ہیں کہ وہ بغلی دروازہ کے باہر زمین پر بے سُدھ پڑا ہے،
اختر رائے پوری نے ہم لوگوں کو دیکھتے ہی کہا، مولانا کا کمرہ کھلواؤ۔ ہم لوگ
فوراً پلٹے۔ مولانا کو باہر نکالا۔ اتنے میں اختر رائے پوری مجاز کو پیٹھ پر لادے
مولانا کے کمرے میں داخل ہوگئے، اور اندر سے کُنڈی بند کرلی، مولانا بیچارے
ہکا بکا رہ گئے۔

تھوڑی دیر میں نمازیوں کی چہل پہل شروع ہوئی، مولانا اُن کے ساتھ ہولئے۔
شاید یہ پہلی نماز تھی جو مولانا نے باجماعت ادا کی تھی، اسلئے کہ تھے تو وہ سچ مچ

کے مولانا، مگر امامت وہ دہریوں کی فرماتے تھے۔ اسکے بعد ناشتہ کی گھنٹی بجی،
لوگوں نے ڈائننگ ہال کا رُخ کیا، اور اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے۔ مولانا
نے اس بیچ میں اپنے کمرے میں باہر سے قفل ڈال دیا۔

جب ہاسٹل میں سناٹا ہوگیا، تو ہم لوگوں نے نیچے جاکر باہر کی کھڑکی سے
خیریت پوچھی۔ اختر رائے پوری نے ایک سانس میں کئی حکم لگادیئے، یہ لاؤ
وہ لاؤ۔ سب حاضر کردیا گیا۔ سارا دن اسی طرح گذر گیا کہ مولانا کے کمرے میں
باہر سے تو قفل لگا ہے اور اندر ایک چھوڑ دو دو چور بند ہیں جب بھی ہم لوگ
اپنی بدحواسی میں خیریت پوچھنے جائیں، اختر رائے پوری ڈانٹ کر بھگا دیں۔
شام کو جاکر مجاز اس لائق ہوا کہ اُسے اختر صاحب اوپر ہم لوگوں کے کمرے میں
لاسکے۔ اب مجاز کی شرمندگی دیکھنے والی تھی، معلوم یہ ہوا کہ وہاں لوگوں نے
اپنے حصّہ کی بھی زیادہ تر اسی کو پلادی تھی۔

میرے خیال میں اس سے پہلے کبھی مجاز نے اس طرح نہیں پی تھی۔ وہ
بار بار یہی کہتا تھا، میں گھر کیسے جاؤں، کہیں اماں کو نہ بھنک لگ جائے۔ یہ خوف
اُسے ہرگز نہ ہوتا اگر وہ اس سے پہلے بھی پی کر بہک چکا ہوتا۔ بہرحال اس کی
گھر جانے کی ہمّت نہیں پڑی جب دوسرے دن کئی بہانے سمجھ میں آگئے ہیں تب
وہ گھر گیا ہے۔

اسی ۳۵ء میں عربک کالج (جو اب دلّی کالج ہے) کی ڈبیٹ کے سلسلہ میں
دلّی جانے کا اتفاق ہوا۔ انصار بھی ساتھ تھے، وہاں کے ایک حجرہ نما کمرہ میں ہم لوگ
بیٹھے تھے کہ پاس کے دوسرے حجرے سے ایک صاحبزادے نکلے، معلوم ہوا آپ

معین احسن ہیں، شاعر ہیں اور جذبی تخلص کرتے ہیں، فوراً شرارت کی سوجھی، میں نے
بڑے انہماک سے اصرار کیا کہ کچھ سنائیے، سننا کم مقصود تھا، مذاق اڑانا زیادہ۔ وہ
شرماتے لجاتے پاس بیٹھ گئے، اور دو ایسے شعر سنائے کہ سارا عزم باطل خاک میں مل گیا
وہ شعر یہ ہیں ——— ؎

کسی سے حالِ دلِ بیقرار کہہ نہ سکا ۔ کہ چشمِ یاس میں آنسو بھی آکے بہہ نہ سکا
نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں ۔ یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا

سرِ نیاز خم کیا، اور اسی وقت مرید ہوگیا۔ وہ بھی مہربان ہوگئے، اور اپنے کمرے میں
لے گئے۔

ایک کونے میں اسٹوو اور دو ایک پیالیاں پڑی ہوئی تھیں، دوسرے کونے میں ایک میز
اور ایک کرسی، بیچ میں ایک جھلنگا سا بنیٹھا، جس سے ملی ہوئی دیوار پر پنسل سے لکھا تھا یہ

پھر کس پہ ستم ڈھاؤگے، بیداد کروگے
مرجائے گا جذبی تو بہت یاد کروگے

غمِ روزگار کا حال سن ہی چکے تھے، غمِ عشق کو بھی نقش بر دیوار دیکھ لیا۔
ایک منحنی سا لڑکا خادمانہ انداز میں چائے بنانے لگا، یہ لطافت حسین تھے۔
معلوم ہوا کہ یہ جذبی کے خادم بھی ہیں، دوست بھی اور مربی بھی۔ یہ وہی لطافت حسین ہیں
جو ۱۹۵۲ء میں اترپردیش کے پارلیمنٹری سکریٹری ہوئے، اور شاید ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء
میں حرکتِ قلب بند ہوجانے سے ختم ہوگئے، اگر بے لوث خدمت اور پرخلوص محبت
کا کوئی صلہ ہے تو انھیں ضرور جوارِ رحمت میں جگہ ملی ہوگی۔
دلّی سے واپسی پر جذبی کی دریافت کا حال مجاز کو سنایا، تو معلوم ہوا کہ

یہ تو چھپے رستم ہیں۔ لکھنؤ کرسچین کالج میں پڑھتے تھے۔ سی ایل بیرا ہاسٹل میں
رہتے تھے، اور ملال تخلص فرماتے تھے۔ اس تخلص کی نحوست سے انکے تعلقات
والد اور سوتیلی ماں سے بگڑتے گئے، اسلئے اب جذبی تخلص کرنے لگے ہیں۔
مجاز کو شاعری کے ڈھرے پر جناب ہی نے لگایا ہے۔ جس نے سنا اسنے کہا
بھئی اسے علی گڑھ بلواؤ۔ آخر کچھ دن بعد ہم لوگ انھیں علی گڑھ گھسیٹ
لائے، اور یونین میں زبردستی غزل پڑھوائی، وہ غزل یہ تھی۔ ؎

انتہائے غم میں مجھکو مسکرانا آگیا
ہائے اخفائے محبت کا بہانا آگیا

دوسری غزل جو نجی محفل میں بہ ہزار منت و سماجت سنائی، وہ بھی غم و اندوہ
میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ؎

شکستہ ساز چھیڑیں اپنی آنکھیں گل فشاں کرلیں
وہ آئیں یا نہ آئیں، ہم تو بزم آرائیاں کرلیں

اس سلسلہ میں ایک اور صاحب کا بھی شعر سنایا ——— ؎

ستم کرلیں، جفا کرلیں، مسلسل سختیاں کرلیں
ابھی میں ہوش میں ہوں آپ میرا امتحاں کرلیں

مجاز کی کامرانی و شادمانی کے مقابلے میں جذبی نے رنج و الم کا جو راگ
چھیڑا، تو ایسا معلوم ہوا جیسے آنکھوں سے پردے ہٹ گئے۔ ساتھ ہی یہ
حیرت بھی ہوئی کہ کس بلا کا انسان ہے کہ غمِ عشق بھی ہے، غمِ روزگار بھی، مگر
ہمت ہے کہ ہارتا ہی نہیں۔ کہتا ہے: ——— ؎

تیرے کرم کی بھیک لے ایسا حقیر غم نہیں ٭ جا اے ستم شعار جا، آ رزوئے کرم نہیں
لوگ شعر کہتے ہیں تو سنانے کے لئے بیتاب رہتے ہیں آپ کا یہ حال ہے، کہ
سناتے ہیں تو سات پشتوں پر احسان کرتے ہیں۔ لاکھ کہا کہ دو ایک روز رک جاؤ،
یہاں چلو وہاں چلو، نہیں چلتے ہو تو یہیں رہو، ان کو بلا لیں گے ان کو بلا لیں گے،
ایک اچھی خاصی نشست ہو جائے گی، مگر نہ ماننا تھا نہ مانا، اُلٹے پیروں واپس گیا۔
اتفاق کہ رات کی گاڑی چھوٹ گئی، دوسری گاڑی ۱۲ بجے صبح ملتی تھی، اسلئے
ساری رات اسٹیشن پر گذارنا پڑی۔ جاڑے کا زمانہ ہے ہم لوگ یعنی مجاز، جذبی،
مشرق میاں اور میں چاروں آدمی ٹی اسٹال کی بنچ پر بیٹھے ہیں، ہوا ہے کہ
کاٹے ڈال رہی ہے، اور چائے کا دور چل رہا ہے، شعر سنانے پر راضی
نہیں ہوا، اسلئے دو پارٹیاں بن گئیں، ایک طرف جذبی اور مجاز، دوسری طرف
میں اور مشرق میاں۔

رات بھر لطیفے ہوتے رہے، شرط یہ تھی کہ جو ہارے وہ چائے کا حساب چکائے،
اللہ کے بندے نے ایک بھی لطیفہ نہ سنایا، ساری رات مجاز اکیلا لڑتا رہا، اور
جذبی کھی کھی ہنستے رہے۔ جب بہت شرم دلائی تو ایک لطیفہ شروع کیا
جس کی شروعات ہی سب سے بڑا لطیفہ تھی۔ آخر گاڑی آ گئی جذبی صاحب
روانہ ہو گئے اور ہم لوگ منھ لٹکائے واپس آ گئے۔

کچھ عرصہ بعد مجاز کا بھی دلّی سے بلاوا آیا۔ اس نے آل انڈیا ریڈیو
دلّی میں جو درخواست دی تھی وہ منظور ہو گئی اور اس کا تقرر ہو گیا۔
کسے معلوم تھا کہ ع یہ خزاں ہے جو بہ انداز بہار آئی ہے

تھوڑے ہی دنوں میں نوکری چھوٹ گئی اور وہ محفلیں اجڑ گئیں جن کی
تلخیاں بھی جاں آفریں ہوا کرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک محفل سے جذبی بگڑ کر
چلے گئے تھے اور رات ہی رات وہ نظم کہہ کر صبح ہونے سے پہلے ہی واپس
آئے تھے، جس کا ایک ایک شعر بڑے تیکھے تیور سے کہا گیا تھا۔

عجب حشر بپا ہے وفا کی دنیا میں
نظر اٹھا جو وہاں تک تری نظر جائے

اب دیار تھے نہ احباب تھے مجاز تھا اور زمانہ کے تھپیڑے تھے۔
"اندھیری رات کا مسافر" اسی طوفان کا پروردہ ہے۔ آخر ع
"نوحہ گر جاتا ہوں میں، نالہ بلب جاتا ہوں میں"
کہتا ہوا مجاز دلّی سے رخصت ہو گیا، مگر اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا
تھا، اس نے چلتے چلتے کہا۔

پھر تری بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور بہ انداز دگر آؤں گا میں

مجاز آتا اور اسی شان سے واپس آتا جس کا اس نے عہد کیا تھا۔ مگر ایک دہرہ
جبیں کے اندیشۂ رسوائی نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ یا یہ عالم تھا
کہ مجاز کے بغیر چاندنی رات بھی اندھیری رات تھی۔ جب تک مجاز کے قدم ایوانِ
عشرت میں نہیں پہنچتے تھے وہاں نیند آتی ہی نہیں تھی ساری ساری رات اس کے
انتظار میں آنکھوں میں کٹ جاتی تھی۔ اس کے شعر گنگنائے جاتے تھے۔ اس کی دھن
تاڑی جاتی تھی۔ اس کے شانے پر سر رکھ دیا جاتا تھا۔ یا مجاز کی دور کی غزل خوانی

میں بھی رسوائیاں جھلکنے لگیں۔ اُسے آوارہ و مجنوں کے خطابات سننے پڑے۔ نصیحتیں کی جانے لگیں۔ آخر دربان کو حکم ہوا کہ مجاز بچہ ہے۔ جس بھی قدم دھرنے پائے، یہ محض اُس کا حوصلہ تھا کہ اُس وقت بھی مجاز نے قنوطیت کے سامنے سر نہیں ڈالی مجھے اس کی محبت تھی کہ ان بے بہروں کو بھی۔ وہ "مجبوریاں" سمجھ کر درگزر کرتا رہا۔ اور اس کی زبان پر شکوہ تک نہیں آیا۔ اور آیا بھی تو وہ شکوہ عنفوان کی حسن میں اس سے کہا ہے:

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوقِ رسوا کی پذیرائی
زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن، آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

جس وقت یہ خیال آتا ہے کہ ان نازنینانِ حرم نے اپنے عشرت کدوں میں بیٹھ کر کیسے کیسے چوچلے برتے ہیں۔ دل داریوں پر آئیں تو دیواریں تک چھا گئی ہیں۔ دل آزاریوں پر آئیں تو خود اپنے ہاتھوں سے دروازے بند کر لیے ہیں اور رسوائی کے نام پر وہ تیر چلائے ہیں کہ مجاز کا کلیجہ چھلنی کر دیا ہے تو ریاکاری کی ایک ہیبت ناک تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ اور جب ساتھ ہی یہ یاد آتا ہے کہ "نورا" جس سے مجاز کو صرف "شرارت کی سوجھی تھی" اُس وقت بھی مجاز کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر چارہ گری کرتی رہی اور وہ جس کا نام بھی مجاز نے اپنے شعر میں صحیح صحیح نہیں آنے دیا ہے اس ظلمت کے طوفان میں بھی اپنا دیا جلائے بیٹھی رہی، تو ایک عجیب قسم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ساری نازنینان

کو ان گنجینہ دارِ درم پر صدقے کر کے پھینک دے اور اتنی دور پھینک دے کہ پھر یہ ہمارے معاشرے میں ڈھونڈنے بھی نہ پائیں۔ دلّی سے لٹ کر مجاز لکھنؤ پہنچا تو وہی محفلیں یاد آنے لگے

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
وہ میرا شعر جب میری ہی لَے میں گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا

لکھنؤ نے مجاز کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی دل جوئی کی، بڑی چارہ سازی کی۔ جذبی، سردار اور سبط سبھی کو بلا لیا۔ جاں نثار آتے ہی رہتے تھے۔ مخدوم تک حیدرآباد سے پہنچنے لگے۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، احمد علی، رشید جہاں، حیات اللہ انصاری یہاں موجود ہی تھے۔ اور بھی صفِ اوّل کے لکھنے والے لکھنؤ ہی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ یہاں کا سیاسی ماحول بھی سازگار تھا، ادبی ماحول بھی سازگار تھا۔ اُمید ہوئی کہ مجاز دلّی کو بھول جائے گا اور سنبھل جائے گا۔ اسی زمانہ کی ایک خاص رات میں جب چاندنی بھی تھی شراب بھی، اور ایک مطرب جاں نواز بھی، "جسے ینگ لیڈی" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا مجاز کی وہ نظم ہوئی جس میں اس نے کہا ہے:-

شیراز بن گیا ہے شبستانِ لکھنؤ

لکھنؤ کی انہی حسین شاموں سے وہ گیت بھی وابستہ ہے جس کا بول ہے راج سنگھاسن ڈانواڈول ۔۔۔ اس کی تحریک ینگ لیڈی

کے ایک ایسے التفات بے حساب سے ہوئی جسے دیکھ کر شاعر بے اختیار
کہہ اٹھا "راج سنگھاسن ڈانوا ڈول" ـــ بعد کے بول بعد میں کہے گئے
اور دوسری کیفیت میں کہے گئے۔

لیکن شاعر کی پیشین گوئی پوری ہو کر رہی۔ کچھ ہی دنوں میں جنگ کا
بم پھٹا۔ یہ محفلیں بھی درہم برہم ہو گئیں اور وہ ادبی سرگرمیاں بھی ایک
نئی سمت میں چل پڑیں۔ اب جذبی اور مجاز دونوں پر یہ اعتراض ہونے لگے
کہ زمانے کے ساتھ نہیں چل رہے ہیں۔ دنیا جنگ کی آگ میں جھلس رہی ہے اور
آپ غزل خوانی کر رہے ہیں۔ جذبی نے اسی اعتراض کے جواب ع

"لے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ"

نظم کہی۔ مجاز نہ بحث و تکرار کرتا تھا نہ جذبی کی طرح اپنی شاعرانہ تعلّی میں کسی کو یہ
صلاح دیتا تھا کہ تم شاعری چھوڑ دو۔ اس کا یہ طریقہ تھا کہ جب دوسروں میں
جھگڑا ہو تو بیچ بچاؤ کرا دے اور جب خود اس پر اعتراض ہو تو خاموش ہو جائے۔
اس نے کہا تو کچھ نہیں مگر اپنے عروس خیال پر ویسی ہی نظریں جمائے رہا۔ اس کا
غم جاناں کیا کم محرک تھا جو وہ غم دوراں کا سہارا ڈھونڈتا۔ چنانچہ عین اسی زمانے
میں جب انقلاب ہر شاعر کا تکیہ کلام ہو رہا تھا اور نہ جانے کتنے شاعر محض زندگی
کی ستم کشی پر شاعر انقلاب بن گئے تھے۔ اس نے بڑے فخر و دعویٰ سے ساتھ کہا

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعر محفل وفا، مطرب بزم دلبراں

ایسا نہیں کہ مجاز اس عالم گیر جنگ سے متاثر نہیں تھا یا نظریاتی طور پر اس کا

حامی نہیں تھا۔ وہ "آہنگ نو" پہلے ہی کہہ چکا تھا۔ مگر یاران تیز خیال کا نظریاتی
تعصب اس زمانے میں ایسا بڑھا ہوا تھا کہ شاعرانہ اشارے و کنائے کافی نہیں سمجھے
جاتے تھے۔ تقاضا یہ تھا کہ صاف صاف تبلیغ کرو۔ خواہ شاعری نعرہ بازی ہو کر
کیوں نہ رہ جائے۔ اس تقاضے کو مجاز کبھی پورا نہ کر سکا۔ جب کبھی اس نے "مزدور
کا گیت" "راج سنگھاسن ڈانوا ڈول" کی سی نظم کہی ہے تو مجاز کی شیریں گفتاری
پھیکی پڑ گئی ہے۔ ہاں "خواب سحر" کی حد تک ضرور اس نے اپنے رفیقوں کی ہمنوائی
کی ہے اور اسی شیریں بیانی کے ساتھ جو مجاز کا حصہ ہے۔

ساتھ ہی ساتھ مجاز نے "رات اور ریل" میں قصر ظلمت پر وہ تیر برسائے ہیں۔ ارتقائے
حیات کے وہ رموز بتائے ہیں اور عظمت انسانیت کے وہ نغمے گائے ہیں کہ انقلاب کا ایک حسین
اور دل آویز نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

مجاز کی یہی آفاقیت ہے جس نے ہر ایک کو آٹھ آٹھ آنسو رلا ڈالا۔
اس کی موت ہوئی تو ترقی پسند حلقوں میں بھی کہرام مچا اور غیر ترقی پسند حلقوں
میں بھی صف ماتم کھڑی ہو گئی۔

مرزا سودا ـــــ ایک تمثیل

"انوریٔ ہند ملک الشعرائے ریختی مرزا محمد رفیع سودا اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب سلطنتِ مغلیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ خوشنوایانِ چمن دلی تو درکنار کلیوں نے بھی مسکرانا اور چڑیوں نے بھی چہچہانا چھوڑ دیا تھا۔ اس دورِ الم کی ترجمانی دو ہی طرح ممکن تھی، یا ایسا شاعر ہو جو اس تباہی و بربادی پر آنسو بہائے یا ایسا جو اس پر جھنجھلا اُٹھے۔ مردم خیز دلی نے آنسو بہانے والے میر بھی پیدا کئے، اور پیچ و تاب کھانے والے مرزا بھی۔

د... بدنظمی و بدحالی جو میر کو آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی تھی، مرزا کی شوخ طبیعت پر تازیانہ کا کام کرتی تھی، وہ جھنجھلا اُٹھتے تھے اور کہتے تھے۔ "غنچہ لانا تو قلمدان" اسکے بعد اللہ دے اور بندہ لے ـــــ آج مرزا بہت ہی برہم ہیں۔"

مرزا۔ (غصّہ) ہاں غنچہ! تو وہ شہ سوار خاں کا بچہ کیا بولا؟۔

غنچہ۔ (مایوسی و ناراضگی) اجی وہ کہنے لگا میرا گھوڑا کوئی کرایہ کا ٹٹو نہیں جو برات بارات میں مانگے جائے۔

مرزا۔ (دانت پیس کر) ہوں۔ میں نے بھی وہ خبر لی ہے کہ بچے ساری عمر یاد کرینگے۔ سُن۔

غنچہ۔ (شوق) ارشاد حضور ارشاد۔

مرزا۔ (عجلت کے ساتھ) ۔ ؎

نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس ؛ رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اُس کا حال ؛ کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد ؛ اُمیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

غنچہ۔ (خوش ہوکر) واہ حضور واہ! کیا اچھی تصویر کھینچ دی ہے، سچ مچ اس کا یہی حال ہے۔

(اتنے میں میر درد آتے ہیں)

درد۔ (تعجب اور مسرت) ہیں یہ تو یہیں محفل مراختہ شروع ہو گئی۔

مرزا۔ (خوش ہوکر) آؤ بھئی درد آؤ، کیا بروقت پہونچے ہو، وہ شہ سوار خاں کو تو تم جانتے ہی ہو؟۔

درد۔ تعجب، ہاں، ہاں۔ خیریت تو ہے۔

مرزا۔ اماں غنچہ کے یہاں شادی ہے نا؟۔

درد۔ ہاں! ہاں!!۔

مرزا۔ میں نے کہا شہ سوار خاں کے یہاں چلے جاؤ، اس کا گھوڑا مانگ لو۔ (غصّہ) کہنے لگا میرا گھوڑا ایسا ویسا نہیں ہے جو ارات برات میں مانگے جائے۔ جانتا ہے کہ غنچہ مجھے کتنا عزیز ہے، اسکے یہاں کام ہے گویا میرے گھر یہاں کام ہے۔ پھر بھی یہ بے مروتی یہ بدماغی میں نے بھی

ایسی ہجو کہی ہے۔ کہ تا عمر یاد کرے گا۔

درد۔ (غم زدہ) کس کس کی ہجو کیجئے گا مرزا صاحب۔ یہاں تو رت ہی پلٹ گئی ہے۔

مرزا۔ (اور بگڑ کر) میں سب کے دماغ ٹھیک کردوں گا۔ جب تک اس زبان میں جنبش ہے میری ہجو کی زد سے کوئی نہ بچ سکے گا۔ خواہ شاہ ہو یا گدا۔

غنچہ۔ (لجاجت کے ساتھ) ہاں حضور! تو وہ بند پھر سے ارشاد ہو؟ خواجہ صاحب بھی ملاحظہ کرلیں۔

درد۔ (تعجب) اچھا! تو کچھ حصہ ہو بھی چکا۔

مرزا۔ نہیں نہیں۔ ابھی شروع ہی کیا تھا۔ تو پھر سے سُنو۔

درد۔ ارشاد۔

مرزا۔ (لطف لیتے ہوئے)۔ نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس ---- میر درد مصرع اٹھاتے ہیں اور غنچہ بھی ساتھ دیتا ہے۔ ع

نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس

مرزا۔ نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس ٭ رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل نے سوار

درد۔ واہ، واہ!۔

مرزا۔ اس مرتبہ کو بھوک سے پہونچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے، مجھے کب کروگے یاد
اُمیدوار ہم بھی ہیں، کہتے ہیں یوں چمار

درد۔ واہ، واہ! کیا فصاحت ہے۔

مرزا۔ ذرا بھوک کی شدت ملاحظہ ہو:۔

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر

درد۔ کیا کہنا ہے ---- اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر

مرزا۔ ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار
تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھاس کا
جو کے کو آنکھ موند کے دیتا ہے وہ پسار
ہے اس قدر ضعیف کہ اُڑ جائے باد سے
میخیں گر اسکے تھان کی ہووے نہ استوار

درد و غنچہ:۔ واہ، واہ!۔

درد۔ الامان والحفیظ۔

مرزا۔ اور لاف و گزاف کا یہ حال ہے، کہ رستم سوار خاں اس کی بھی تاریخ بیان فرماتے ہیں، سو اس کا بھی حال سُن لیجئے:۔

خستہ ہے اس قدر کہ بجز اس کی پُشت پر
دجّال اپنے مُنھ کو سیہ کر کے ہو سوار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لیکے ریگِ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے ز روئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

درد۔ کیا کہنا ہے، یہ رفعت و یہ عظمت۔

غنچہ۔ (بے حد خوشی میں) اور حضور وہ فرماتے ہیں کہ جب مرہٹوں نے چڑھائی کی تھی
تو وہ اسی گھوڑے پر بیٹھ کر لڑے تھے۔

مرزا۔ (طنز) کیوں نہیں لڑے تھے اور خوب لڑے تھے۔ سُنئے ــــــــــ سہ

جس شکل سے سوار تھا اُس رن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
آگے سے تو بڑا اُسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
دھوبی کمہار کے گدھے اُس رن جُتے تھے گم
اِس ماجرے کو سُن کیا دونوں نے واں گذر
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دُم کمہار
جب دیکھا میں نے جنگ کی یاں آ بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

درد۔ واہ مرزا واہ! حد کر دی۔ گھوڑے کو سوار سے بڑھا دیا، اور سوار کو گھوڑے سے۔ "لے جوتیوں کو ہاتھ میں، گھوڑا بغل میں مار" کیا نقشہ کھینچ دیا ہے، تعریف نہیں ہو سکتی۔ میرے خیال میں تو آج اُستاد کے یہاں یہی پڑھو۔

مرزا۔ وہاں تو "شہر آشوب" کا ارادہ ہے، جس میں سب ہی کی خبر لی گئی ہے۔ غنچہ ذرا وہ بستہ لانا تو کھینچی سے۔

غنچہ۔ ابھی حاضر کرتا ہوں۔

مرزا۔ اچھا بھئی اب چلنے کی ٹھہرے، آج بھی دیر ہوئی تو اُستاد بگڑ ہی جائیں گے۔

راوی:۔ اُستاد سے دہلی کے مشہور عالم و فاضل خان آرزو مُراد ہیں۔ آپ کو سب ہی احتراماً اُستاد کہتے تھے۔ ہر چاند کی پندرھویں تاریخ کو خان آرزو کے یہاں محفل مراختہ ہوا کرتی تھی، یہ محفل مشاعرے کے توڑ پر شروع کی گئی تھی، اور اُس نے اتنی جلد مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ فارسی کہنے والوں کے لئے بس ایک ہی محفل مشاعرہ رہ گئی تھی، جو مرزا بیدل کے عُرس کے موقع پر منعقد ہوتی تھی۔ باقی ہر مہینہ میں مراختہ ہی کی محفلیں ہوا کرتی تھیں جن میں ریختہ یعنی اس وقت کی ہندوستانی زبان میں کہنے والے شریک ہوتے تھے۔ آج خان آرزو کے یہاں میر سجاد، جعفر علی خان ذکی، میر علی نقی اور میر تقی میر سب ہی جمع ہیں۔ یہ لیجئے درد اور مرزا سودا بھی پہونچ گئے۔

خان آرزو۔ آؤ بھئی سودا، آؤ! بڑا انتظار دکھاتے ہو؟۔

سودا۔ (معذرت) کیا عرض کروں اُستاد، دیر ہو ہی جاتی ہے۔

آرزو۔ بھئی درد میر نے کیا غزل پڑھی ہے، طبیعت خوش کر دی۔

درد۔ اُستاد! مرزا بھی آج ایک تازہ ترین ہجو لے کر آئے ہیں، خاص آپ کو

سُنانے کے لئے۔

آرزو۔ ہاں! تو بھئی پڑھو مرزا، کیا شوخ طبیعت پائی ہے۔

مرزا۔ اُستاد! یہ اُس دن کی چوری سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔

ایک آواز۔ بھئی مرزا معاف کرنا، قطع کلام ضرور ہوتا ہے، مگر میں تو اُس مخمس کے لئے اصرار کروں گا۔

دوسری آواز۔ جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔

مرزا۔ مگر میں بیاض تو لایا ہی نہیں، اور زبانی شاید ہی دو ایک بند یاد ہوں۔

ایک آواز۔ دو ہی بند سہی۔

دوسری آواز۔ اجی ایک ہی بند سہی۔

مرزا۔ اتنا اصرار ہے تو مُلاحظہ ہو۔

آوازیں۔ ارشاد، ارشاد!۔

مرزا۔ امیر اب جو ہیں دانا انھوں کا ہے یہ چال
ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانہ کی چال
بچھی ہے سوزنی، خوجہ کھڑا جھلے ہے رومال
حضور بیٹھے ہیں ایک دو ندیم اہلِ کمال
دھری ہے روبرو ایک پیکدان اور تنبول

ایک آواز۔ واہ، واہ، سُبحان اللہ!۔

مرزا۔ جو کوئی ملنے کو ان سے انھوں کے گھر آیا
ملے یہ اُس سے، مگر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکرِ سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا
انھوں نے پھیر کے ادھر کو مُنھ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

آوازیں۔ واہ، واہ! کیا جہانبانی ہے۔

مرزا۔ عجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ بُرقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے حُسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول

آوازیں۔ واہ، واہ، وا!

میر۔ (زانو پیٹ کر) عبرت کا مقام ہے۔

مرزا۔ بس جناب آپ کی فرمائش ہو گئی۔

میر۔ بھئی مرزا! اسے سُن کر تو رونا آتا ہے۔

اُستاد۔ سچ کہتے ہو میر۔ ظالم نے اس بلا کا طنز کیا ہے، کہ ہنسی ہی ہنسی میں آنسو نکل آتے ہیں۔ چلو بھئی کچھ اور سُناؤ۔

مرزا۔ عرض کرتا ہوں! یہ آج کل کی وبائے عام چوری پر کہی گئی ہے، پہلے کوتوال صاحب کی چوروں سے گذارش مُلاحظہ ہو:۔

آوازیں ۔ ارشاد، ارشاد!

مرزا ۔ ایک دن اس نے سب سے طنز کی راہ

کہا، تم ہو مرے نیٹ دل خواہ

چیز کوئی جواب چرا لاؤ تم

چوک میں بیچنے نہ جاؤ تم

قیمت اُس کی جو کچھ مشخص ہو

اُتنے کو تم اُسے مجھی کو دو

مرزا ۔ چوروں کا جواب ملاحظہ ہو :- ؎

کیا جب آپ تم نے یہ انصاف

میں بھی کرتا ہوں عرض رکھیے معاف

آپ کے سر پہ یہ جو پگڑی ہے

دو خریدار اس کے ہیں درپے

دس روپئے وہ مجھے دلاتے ہیں

کہیئے، اب آپ کیا لگاتے ہیں

ایک آواز ۔ بھئی حد ہو گئی مرزا، یہ دیدہ دلیری۔

مرزا ۔ کوتوال صاحب کی بے بسی ملاحظہ ہو :- ؎

بولے ہو وہ کہیں بھی ہوں ناچار ؛ گرم ہے جوتوں کا اب بازار

کرتے ہیں اب بجا کر ڈھول ؛ میری پگڑی کا مجھ سے سر پر مول

یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور ؛ دیکھو ٹک کہاں کہاں ہے چور

مٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل ؛ ہے امیروں کے گھر میں چور محل

دیکھئے گر بتاں کو بھی بخدا ؛ ہاتھ میں ہے انھوں کے دزدِ حنا

کس کو ماروں میں کس کو دوں گالی ؛ چوری کرنے سے کون ہے خالی

راوی ۔ چور کوتوال کی پگڑی پر دانت لگائیں، اور یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی میدانِ جنگ سے بھاگے، اور اس طرح، کہ جوتیاں ہاتھ میں اور گھوڑا بغل میں، مبالغہ کی حد ہے، مگر شاعرانہ کمال کی بھی حد ہے کہ ساری تلخیاں شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اُترتی چلی جاتی ہیں جس شخص نے نعمت خان عالی کی گود میں آنکھیں کھولی ہوں، رقعاتِ عالمگیری سے بسم اللہ کی ہو، اکبر و جہانگیر کے چرچوں میں پرورش پائی ہو اس سے مغلوں کا یہ عبرتناک زوال کیسے نہ دیکھا جائے۔

آخر مرزا کا دل پک گیا، اور وہ دلی سے چل کھڑے ہوئے، برسوں فرخ آباد میں دادِ سخن پائی، پھر فیض آباد پہونچے، اور وہاں سے لکھنؤ آئے، یہاں ایک عجیب واقعہ ہوا ـــــ ایک روز لکھنؤ میں سودا کے مکان پر مرزا فاخر کے شاگردوں نے یورش کر دی ـــــ دروازہ پیٹنے اور کنڈی کھٹ کھٹانے کی آوازیں :-

آواز ۱ :- دروازہ کھول۔

آواز ۲ :- ابے غنچہ کا بچہ دروازہ کھول۔

آواز ۳ :- کھولتا ہے کہ نہیں۔

آواز ۴ :- ابے کھول کھول۔

(مکان کے اندر)

غنچہ۔ (سرگوشی) حضور کیا حکم ہے، میں تو سمجھتا ہوں آپ صحنچی میں چلے جائیں، اور میں شیرہ کو چھوڑ دوں۔

(شیرہ کے بھونکنے کی آوازیں)

مرزا۔ (ڈانٹ کر) گھبراتا کیوں ہے، جا دروازہ کھول دے۔

(آوازیں آتی رہتی ہیں)

غنچہ۔ (ذرا سہما ہوا) حضور بہت سے آدمی ہیں۔

مرزا۔ (ڈانٹ کر) ہونے دے، جا دروازہ کھول دے۔

(دروازہ کا کھلنا۔ شیرہ کا زور زور بھونکنا، مختلف آوازیں)

ع۱۔ یہ دلی نہ باشد۔

ع۲۔ جو منھ میں آیا کہہ دیا۔

ع۳۔ جی ہاں، کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔

ع۴۔ منھ میں لگام ہی نہیں ہے۔

مرزا۔ (چڑھ کر) کیوں بھئی بقاء اللہ؟ لکھنؤ کی یہی تمیز ہے۔

بقاء۔ (ٹھنڈے دل سے) معاف کیجئے گا مرزا صاحب۔ میں نے تو بہت۔۔۔

آواز ع۱۔ (بگڑ کر) بس بس، رہنے دو اپنی صلح جوئی، ہٹو ادھرے۔ سُنئے مرزا صاحب! پیام و سلام بہت ہو چکے، ایک نہیں تین بار بقاء اللہ آپ سے ملے، اور یہ عرض کیا، کہ ہمارے اُستاد کی شان میں ایسی ویسی باتیں نہ کہا کیجئے۔

آواز ع۲۔ جی ہاں! مگر آپ ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔

مرزا۔ (غصہ سے) اچھا! تو اب آپ یوں منوانے آئے ہیں، اس طرح یلغار کرتے شرم تو نہیں آتی۔

بقاء اللہ۔ معاف کیجئے گا مرزا صاحب۔۔۔۔۔۔

ایک آواز۔ پھر تم نے بکواس شروع کی۔

دوسری آواز۔ ابی! سب سے پہلے ہم پر اُستاد کا احترام لازم ہے۔

مرزا۔ (بگڑ کر) تو آخر چاہتے کیا ہو؟ میں بھی تمہارے اُستاد سے اصلاح لینے لگوں؟

آواز ع۱۔ ہم بس اتنا چاہتے ہیں، کہ آپ ہمارے اُستاد کے پاس چلے چلیں۔

آواز ع۲۔ جی نہیں اور اُن سے معافی مانگیں۔

مرزا۔ (بگڑ کر) کیا بکتے ہو!

بقاء اللہ۔ معافی تلافی کچھ نہیں مرزا صاحب، بس آپ چلے چلیں، اُس کے بعد آپ جانیں اور اُستاد جانیں۔

مرزا۔ (بیتاب ہو کر) بلاؤ کہاروں کو ابھی چلتا ہوں۔

(شیرہ بھونکتا رہتا ہے)

غنچہ۔ (سرگوشی کے لہجہ میں) حضور! اس کو کھول دوں؟

مرزا۔ (بگڑ کر) نہیں، میانہ تیار کراؤ۔

راوی۔ آگے آگے میانا، میانے کے ساتھ ساتھ غنچہ، اور غنچہ کے پیچھے یہ مجمع، غرض سب کے سب مرزا فاخر کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے، حسنِ اتفاق کہ

اِدھر سے مرزا کی سواری جا رہی تھی، اور اُدھر سے آصف الدولہ کے چھوٹے بھائی نواب سعادت علی خاں کی سواری آ رہی تھی۔ بیچ چوک میں آمنا سامنا ہو گیا۔

نقیب :- باادب، باملاحظہ، نواب سعادت علی خاں کی سواری آتی ہے۔

* * * * * * * * * * *

* * * * * * * * * * *

راوی ۔ جو راہ رو جہاں تھا وہیں رُک گیا، جیسے ہی سعادت علی خاں کا ہاتھی پاس آیا، غنچہ یوں فریادی ہوا۔

غنچہ ۔ دہائی ہے سرکار کی!۔

نواب ۔ (حیرت) ہائیں۔ کون؟ غنچہ۔

غنچہ ۔ حضور! آپ کا نمک خوار غنچہ۔

نواب ۔ (گرج کر) مہاوت، بٹھاؤ ہاتھی کو، یہ کیا ماجرا ہے؟۔

راوی ۔ ہاتھی بیٹھ گیا، نواب سعادت علی خاں اُترے، اور میانہ کے پاس آ گئے۔

نواب ۔ ارے مرزا صاحب آپ؟۔

مرزا ۔ جی ہاں! میں، مرزا فاخر کا اسیر۔

نواب ۔ (دانت پیس کر) ہوں! یہ حرکتیں، سمجھا۔ (لہجہ بدل کر) آئیے مرزا صاحب! آپ میرے ساتھ تشریف لائیے۔ مجھے آپ کو اِس حال میں دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی، خیر دیکھا جائے گا۔

راوی ۔ سعادت علی خاں نے مرزا سوداؔ کو بصد ادب اپنے ہاتھی پر بٹھایا،

اُسی وقت اپنے بھائی نواب آصف الدولہ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

نواب ۔ بھائی صاحب! یہ غضب، یہ اندھیر! جسے باوا جان نے برادرِ مشفق من لکھ کر خطاب کیا، جسے کتنی آرزوؤں کتنی تمناؤں کے ساتھ فرخ آباد سے فیض آباد بُلایا، اُسے مرزا فاخر کا غولِ بیابانی اِس طرح کشاں کشاں بیچ چوک سے لے جائے۔

آصف الدّولہ ۔ سچ کہتے ہو، مرزا ہمارے چچا کے برابر ہیں۔ (لہجہ تیز) آپ کی توہین ہماری توہین ہے (لہجہ تیز) بلاؤ شہر کوتوال کو، حاضر کرو مرزا فاخر کو، اور حکم دو کہ شیخ زادوں کے محلّہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔

مرزا ۔ (بیتابی سے) جہاں پناہ!

آصف الدّولہ ۔ مرزا صاحب! ہمیں آپ سے بڑی ندامت ہے۔

مرزا ۔ حضور کی ذرّہ نوازی ہے، مگر حکم ہو تو کچھ بندہ بھی عرض کرے۔

آصف الدّولہ ۔ شوق سے فرمائیے!۔

مرزا ۔ عرض یہ ہے کہ میری اور مرزا فاخر کی لڑائی قلم اور کاغذ کی لڑائی ہے، اس کا فیصلہ اسی میدان میں بہتر رہے گا۔

آصف الدّولہ ۔ مرزائے محترم! ہم آپ کے علم و فضل کے تو قائل تھے ہی، آج آپ کی محبت و مروّت کے بھی قائل ہو گئے۔

چوبدار ۔ جہاں پناہ! مرزا فاخر حاضر ہیں۔

آصف الدّولہ ۔ آنے دو۔ .. .. مرزا فاخر تمہاری طرف سے

بہت ہی نازیبا حرکت ہوئی ہے، اگر شاعری کا غرہ ہے، تو مرزا کے
روبرو ہجو کہو، ہم بھی تمھاری اُستادی دیکھیں۔

[م]رزا فاخر۔ ایں از ما نمی آید۔

آصف الدولہ۔ (بگڑ کر) ایں از شما می آید کہ شیاطین خود را بر سر
مرزائے بیچارہ فرستادید از خانہ بہ بازارش کشیدند و می خواستند
آبرویش بخاک بریزند۔ (لہجہ بدل کر) — مرزا سودا! آپ ان کی
ہجو کریں، اور فارسی میں کہیں، جس پر مرزا فاخر کو بڑا ناز ہے۔

[م]رزا۔ جناب فاخر ملاحظہ فرمائیں :۔ ے

تو فخر خراسانی و فا ساقط ازو * گوہر بدہاں در آبی و را ساقط ازو
روزاں و شباں ز حق تعالیٰ خواہم * مرکب وحدت خدا و با ساقط ازو

آصف الدولہ۔ مرزائے محترم کے جیب و دامن موتیوں سے بھر دیئے جائیں،
چھ ہزار کا وظیفہ جاری کیا جائے، اور مرزا فاخر بہ یک بینی و دو گوش
واپس جائیں۔

[ر]اوی۔ اس افسوسناک، مگر خوش انجام واقعے کے بعد سودا کو وہ شہرت و
فراغت حاصل ہوئی، کہ کچھ دنوں کیلئے وہ دلی کو بالکل بھول گئے۔
پھر وہی محفلیں آراستہ ہونے لگیں، جو سودا کی جوانی میں دلی میں
ہوا کرتی تھیں، آج ایک ایسی ہی محفل گرم ہے، دوستوں اور شاگردوں
کے علاوہ سرفراز الدولہ، حسن رضا خاں بھی تشریف رکھتے ہیں، جو
مرزا سودا کے ممدوح بھی ہیں اور شاگرد بھی۔

مرزا۔ سنو بھئی نواب، ایک تازہ غزل سنو۔

نواب۔ ارشاد! اُستاد ارشاد!۔

مرزا۔ گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی۔

نواب۔ (مصرع اٹھاتے ہوئے) گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی۔

مرزا۔ گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

آوازیں۔ واہ وا۔

نواب۔ کیا مطلع فرمایا ہے اُستاد، تعریف نہیں ہو سکتی،

آواز۔ دھوئیں یار کر دیئے ہیں، دوسرا کہے خون تھوک دے۔

آواز۔ ایک بار اور عنایت ہو۔

مرزا۔ گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

آوازیں۔ اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

مرزا۔ کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے، وگرنہ

آوازیں۔ کیا ضد ہے مرے ساتھ ... ...

مرزا ——— ے

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے، وگرنہ
کافی ہے تسلی کو مری ایک نظر بھی

مرزا۔ دوسرا شعر سنو۔ ے

اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہماری
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی

نواب وغیرہ۔ واہ، واہ! پھر عنایت ہو۔

مرزا۔ اے ابر قسم ہے تجھے ...... تجھ چشم سے ......

اے نالہ صد افسوس جواں مرنے پہ تیرے
پایا نہ تنک دیکھنے میں روئے اثر بھی

کس ہستیٔ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

نواب۔ کیا مرصع غزل فرمائی ہے۔ مطلع اور مقطع کا تو جواب نہیں ہے
پھر ارشاد ہو۔

مرزا۔ سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

(واہ واہ کی آوازیں)

نواب۔ (نیاز مندی سے) اُستاد میر صاحب نے بھی اس مضمون کو اچھا
باندھا ہے۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

مرزا۔ ہوں، اچھا کہا ہے۔ مگر میں تو یوں کہتا۔ ؎

سوداؔ کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے، ابھی آنکھ لگی ہے

نواب۔ کیا بات ہے استاد ـــــ خدامِ ادب بولے آپ کا مقطع
آسمان کا تارا بن گیا۔

راوی۔ ایک دن یہی محفل غزل خوانی محفل عزا بن گئی ۱۱۹۵ھ کی چوتھی رجب تھی کہ
مرزا محمد رفیع سوداؔ اس جہان سے رخصت ہو گئے، اور آغا باقر کے امام باڑہ میں
سپردِ خاک ہوئے۔ آج مرزا سودا کے نام پر آخری محفل ہو رہی ہے، دوست
اور دشمن سب ہی ماتم کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے میر فخر الدین ماہر سے
قطعۂ تاریخ سنئے ـــــ ؎

خلد کو جب حضرت سوداؔ گئے ٭ فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے مصحف دُور کر پائے عناد ٭ شاعرانِ ہند کا سرور گیا

راوی۔ شفیق اورنگ آبادی نے کہا ـــــ ع
ائے سوداؔ جہان سے گذرے

قمر الدین منتؔ نے کہا ـــــ ع
بگفت گوہرِ معنی یتیم شد ہے ہے

میر فخر الدین ماہر کا قطعۂ تاریخ مرزا سودا کے مزار پر کندہ کر دیا گیا لیکن
اہلِ کمال مٹی میں مل جانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ چنانچہ مرزا سودا کے اشعار
آج بھی لکھنؤ کی فضا میں گونج رہے ہیں۔